رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جو نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا ہے، ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے، جسمین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ مین کمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر مسئلہ وار بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے، جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کیگئی ہے کہ اسمین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں سے، تقطیع خورد صہ روپے، حصہ سوم تقطیع کلاں سے، للعہ، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں عہ، ۸ سے، تقطیع خورد معہ و عہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ، للعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ)

جلد ۴۰	ماہ شعبان المعظم و رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۷ء	عدد ۵

مضامین

شذرات

ہندوستان میں مسلمانون کی جو تاریخ مختلف زمانون مین تاریخ والون نے لکھی، وہ حقیقت مین مسلمانون کی نہین، بلکہ مسلمان بادشاہون کی ہے، یہی سبب ہے کہ اس تاریخ سے مسلمانون کے علوم وفنون، تمدن اور معاشرت کے حالات کا پتہ چلانا نہایت ہی مشکل ہو، اہلِ علم اور اہلِ کمال کے سوانح یہاں بہت ہی کم لکھے گئے، اس لئے اس ملک کے مسلمانون کی علمی اور تمدنی تاریخ کی ترتیب اور بھی مشکل ہو، ہماری تاریخ کی اس روشنی مین وہی ذرے چمک سکے جو بادشاہون کے دامنِ دولت سے لپٹے رہے،

پچھلے معارف میں "لاہور کے فلکی آلات ساز خاندان" پر جو مضمون نکلا تھا اس کے کسی فرد کا نام ابھی ہم کو یہین اب تک نہین ملا، وہ کل پیتل کے ریاضی آلات کے کتبوں سے لیکر جمع کئے گئے تھے اور اپنے جانتے ہم سمجھے کہ اب اس خاندان کے کسی فرد کا نام نہین چھوٹا، لیکن اس مضمون کو پڑھکر حیدرآباد دکن سے ایک شائق علم سید مبارز الدین صاحب رفعت نے مجھے اطلاع دی کہ ناندیڑ دکن میں مولوی شاہ برہان اللہ حسینی صاحب سجادہ نشین درگاہ قندھار (دکن) کے پاس، اللہداد کے پڑپوتے، عیسیٰ کے پوتے اور محمد مقیم کے بیٹے حامد اسطرلابی کا بنایا ہوا ایک اسطرلاب ہو جس پر یہ نام کھدا ہوا ہے،

"عمل اقل العباد حامد ابن محمد مقیم ابن عیسیٰ ابن اللہداد اسطرلابی، لاہوری ہمایونی تاریخ ۳ شہر شوال سنہ ۱۰۹۰ھ"

اس سے معلوم ہوا سنہ ۹۷۵ھ سے لیکر سنہ ۱۰۹۰ھ یعنی کم سے کم سوا سو برس تک یہ خاندان ریاضی آلات کے بنانے مین ممتاز رہا، لیکن ہماری تاریخ کی زبان اس کے تعارف سے بالکل خاموش ہو،

اسی طرح ہماری تاریخ کے کچھ وہ اوراق بھی ہیں جو پرانی عمارتوں اور قبرون پر نقش ہین، لیکن اب جب ہماری بڑی بڑی عمارتین پرانی ہوکر زمین کے برابر ہورہی ہین، ان کے پتھر اور نقش کے کتبے جو ہماری تاریخ کے ورق ہین، ایک ایک کرکے کھوئے چلے جاتے ہین، اور ہم کو احساس تک نہین ہورہا ہے، دوسری قومین آج زمین کے طبقون کو الٹ الٹ کر اپنے بزرگون کی نشانیاں نکال رہی ہین، اور ہم ہین کہ اُن نشانیون کو بھی بچاکر رکھ نہین سکتے جو ابھی تک خدا کے فضل سے زمین کے نیچے دفن نہیں ہوگئی ہین،

سندھ میں عربون کی تین سو برس تک کی حکومت رہی، لیکن کیا عجیب بات ہے کہ اس زمانہ (سنہ ۹۲ھ سنہ ۴۰۰ھ) تک کی ایک یادگار کا بھی پتہ ہم کو نہین لگ سکا، اسی لئے اس زمانہ کی تاریخ کے کھوئے ہوئے ورق اب کسی طرح نہین ملتے، حالانکہ اسی سرزمین کے طبقون کو کھود کر ہمارا محکمۂ آثارِ قدیمہ مسیح سے سینکڑوں برس پہلے کی تہذیب کا پتہ لگا رہا ہے، سندھ کا گزٹیر اس بارہ مین ہر صوبہ کے گزٹیر سے زیادہ ناقص ہو،

دار المصنفین میں تاریخِ ہند کی پہلی جلد سندھ کی تاریخ لکھوائی گئی ہو، اس کے لئے بہت چاہا کہ محکمۂ آثار کی کوششون سے اگر کچھ پرانے معلومات مل جائین تو تاریخ کے سادہ ورق بھر دیئے جائین، مگر ہم کو اس مین ذرا کامیابی نہین ہوئی، ضرورت ہو کہ آثارِ قدیمہ کا محکمہ ادھر توجہ کرے، اور اب بھی عربی اور فارسی کی جو یادگارین اور تاریخی کتبون کے جو پتھر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہین، اُن کو تلف ہونے سے بچایا جائے، اور اُن کے کتبون کے فوٹو محفوظ کئے جائین، اور ان کے مضامین کو حل کرکے چھاپا جائے،

اس سلسلہ مین لاہور کے معارفِ اسلامیہ کا ادارہ جو کچھ کررہا ہے وہ ہماری قدر کا مستحق ہے، اس کے لائق صدر پرنسپل محمد شفیع صاحب نے خود تکلیف اٹھاکر سندھ کی بعض بعض پرانی آبادیون اور ویران کھنڈرون کو جا کر

دیکھا اور جہاں تک بن سکا اُن کے کتبون کے چربے اتارے اور ان کے فوٹو اور نظیں کالج کے رسالہ مین چھپے ہیں مولوی محمد عبد اللہ صاحب چغتائی کو ادارہ نے اخراجات دے کر مغربی ہند بھیجا تو وہ وہان سے سو سے زیادہ ایسے کتبون کے چربے اتار کر لائے جو اب تک چھپے نہین تھے، ان سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے تاریخی خزانہ کے کتنے جواہر ابھی تک ہمارے التفات کے منتظر ہین،

سر شیخ عبد القادر ممبر انڈیا کونسل لندن جو ہماری زبان کے ایک پرانے خادم ہین، ابھی انگلینڈ سے واپس آئے ہین، انھون نے اس موقع پر اپنی زبان کے موزون نام کے متعلق اخبارون کو یہ بیان دیا ہے،

"کئی موقعون پر ہندو اور مسلمان اظہار کر چکے ہین کہ ملک کی واحد زبان ہندوستانی ہو، چند دن روز پیشتر بہار کی دو پارٹیوں میں مصالحت کی اطلاع چھپی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دونون پارٹیان اردو اور ہندی کو بالکل ایک سمجھتی ہین، ایسے فیصلوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے، تاکہ مستقل حل دستیاب ہو سکے، میں بھی ہندوستانی کو ملک کی مشترکہ زبان سمجھتا ہون، کیونکہ یہ مسلمانون اور ہندؤن کے متحدہ اقدامات سے بنی ہے"

پچھلے معارف میں ہم نے اردو اخباروں کی مشکل پسندی اور عربی اور فارسی کے موٹے موٹے لفظون کے استعمال کے خلاف جو کچھ لکھا تھا، خوشی ہوئی کہ اسکا کسی نے برا نہ مانا، بلکہ بہت سے دوستون نے اسکی تائید کی، آپ سنین کہ ایک اخبار میں ایک بڑے مذہبی مدرسہ کے فاضل ایک الحاد نگار کی پیروی میں لکھتے ہیں "ستھری ذہنیت کی تخلیق کرتی ہے"، حالانکہ نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ "ستھری ذہنیت پیدا کرتی ہے" ابھی ایک مشہور اخبار مین پروپگنڈے کے لئے دعایۃ کا لفظ نظر سے گذرا جسکو شاید بڑے بڑے عربی دان بھی نہ سمجھین، آپ سمجھ سکتے ہین کہ اس بولی مین ہمارے عوام کی سیاسی اور اصلاحی تربیت کیونکر ہو سکتی ہے؟

میرا مختصر سفرِ دکن

اور اعلیحضرت خسروِ دکن و برار کی بارگاہ مین میری باریابی و سرفرازی اور عطائے شاہی میں اضافہ

اکتوبر کے آخر مین مجھے مدراس جانے کی ضرورت ہوئی، واپسی مین صرف دوستون سے ملنے کی خاطر چند روز کے لئے راستہ مین حیدر آباد ٹھہر گیا، حیدر آباد مجھے علمی اور قومی ضرورتون کے سبب سے بارہا جانے کا اتفاق ہوا، مگر میرا یہ سفر بالکل بے غرضانہ تھا، اعلیحضرت کی بارگاہ میں جہاں مجھے کئی دفعہ باریابی کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، اس دفعہ زمانۂ قیام کے کم ہونے کے سبب سے باریابی کا خیال بھی نہ تھا،

۲۹ کی صبح کو دوستون نے مدراس میں الوداع کہا، اور گاڑی دکن کی سمت روانہ ہوئی، ۳۰ر اکتوبر کی صبح کو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچی حسب معمول مولنٰا عبد الباری صاحب ندوی اور مولنٰا مناظر احسن صاحب گیلانی کے یہاں قیام ہوا، اسی کی رات کو محبِ گرامی جناب ہوش بلگرامی کے یہاں جو میرے پرانے دوست ہین کھانا تھا، اُن کے قلم مین جہان ادبی نزاکتین بھری ہیں، اُن کے دسترخوان میں لکھنؤ، رامپور اور دکن کی ساری نفاستین یکجا ہین،

اخباروں مین گو میرے آنے کی اطلاع چھپ گئی تھی، مگر اعلیحضرت کی بارگاہ میں معمول کے مطابق اپنی حاضری کا معروضہ نہیں گذرانا تھا، اور نہ اس کا خیال تھا، مگر وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کا نقشہ دیکھیے کہ اعلیحضرت نے اخبارون میں میرے آنے کی اطلاع ملاحظہ فرمائی، تو ازراہِ ذرہ نوازی ۵ر شعبان المعظم کی رات کو مرحمت خاصہ مرحمت فرمایا اور سہ شنبہ (۷ر شعبان) کو ۱۱ بجے سعادت اندوزی کا حکم فرمایا، اس غیر متوقع سرفرازی سے مجھے اور میرے ساتھ میرے

دوستون کو بہت خوشی ہوئی، ۳۹ گھنٹوں کے انتظار کے بعد وہ وقت آیا جب میں کنگ کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے جا کر کھڑا ہوا، اعلیحضرت کی سادگی اور سادہ پسندی کا حال معلوم تھا، اس لئے ظاہری لباس اور پوشاک میں کسی قسم کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا، چوبدار نے اطلاع کی اور ٹھیک ۱۱ بجے یاد فرمایا گیا، پردہ کا بادل جیسے ہی ہٹا آصفی خاندان کا چشم و چراغ سامنے نظر آیا جب معمول ایوان کے ایک چھوٹے سے برآمدہ میں جو ہر قسم کے ظاہری تکلف سے بے نیاز تھا، دو کروڑ انسانوں کا حاکم نہایت ہی سادہ لباس میں ایک کرسی پر جلوہ افروز تھا، سلام مسنون کے بعد سامنے کی دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ہوا،

اعلیٰ حضرت نے گفتگو شروع فرمائی، اور مسلمانوں کی مذہبی حالت، اور مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت اور اس سے مسلمان والدین کی بے پروائی پر نہایت دردمندانہ خیالات ظاہر فرماتے رہے، تقریر کا سلسلہ آجکل کے بعض باطل فرقِ اسلامیہ کی طرف منعطف ہوا، اور دیر تک ان کی گمراہی اور بے راہ روی پر افسوس فرماتے رہے، پھر آجکل کے علما، اور مشائخ کی سستی، بے علمی اور طریقِ سلف سے انحراف پر تاسف ظاہر فرمایا،

خاکسار نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے، ان باتوں کی مزید تشریح خدمتِ شاہانہ میں عرض کی، اور جابجا موقع سے قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے اپنے معروضہ کو مؤید کیا، اعلیحضرت کی زبانِ مبارک سے بار بار تحسین و آفرین کے حوصلہ افزا الفاظ بلند ہوئے، اور نہایت بشاشت اور توجہ کے ساتھ میرے معروضات کو سماعت فرماتے رہے، میں جب کبھی کوئی آیت کریمہ یا حدیث شریف پیش کرتا، فوراً توجہ شاہانہ کے آثار روئے مطلعِ انوار پر جھلکنے لگتے، ایک موقع پر جب میں نے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ پڑھا اور اس کی تشریح کی تو چہرۂ انور پر اثر کی ایک خاص کیفیت طاری ہوئی، اور دوبارہ اس کو پڑھوایا، اسی طرح وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کی تشریح جب گذارش کی تو محظوظ ہوئے،

رمضان المبارک کی اہمیت، روزوں کی عظمت اور اس فرض کی طرف سے امراء کی غفلت پر تاسف ظاہر فرمایا، آخر میں میں نے اعلیحضرت کی ان فارسی تحریروں کی طرف اشارہ کیا جو آجکل حیدرآباد کے اخباروں میں

شائع ہوتی رہیں، تو ارشاد فرمایا کہ میں تو سعدی و حافظ کی سادہ عبارت پسند کرتا ہوں، اور اسی کی پیروی کرتا ہوں، آجکل کی نئی فارسی پسند نہیں، خاکسار نے گذارش کی آجکل کی نئی فارسی تو فرانسیسی قالب میں ڈھلتی جارہی ہے اور یورپین مفرس لفظوں کی بہتات سے ایک نئی زبان ہو رہی ہے، یہ بھی ارشاد ہوا کہ سیرۃ نبوی کبھی کبھی پڑھا کرتا ہوں، گفتگو کے بیچ بیچ میں بار بار یہ خیال میرے دل میں گذر رہا تھا کہ اس وقت ایک مملکتِ عظمیٰ کا سلطانِ وقت کس بے تکلفی سے ایک باریاب کو اپنی ہمکلامی کی عزت بخش رہا ہے، اور علم و فن کی قدر دانی کا کیسا عملی ثبوت دے رہا ہے، اور یہی وہ مثالیں ہیں جن پر اسلام کی تاریخ کو ناز ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں کئی دفعہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلامی فرمانرواؤں کی بارگاہوں میں باریابی کے موقعے ملتے رہے ہیں، اُن میں سب سے پہلے ہر ہائینس سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیۂ عالیہ بھوپال میں یہ مذہبی جوش اور ذاتِ پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی دیکھی تھی، اور یا اعلیحضرت سلطان العلوم خسروِ دکن آصف سابع خلد اللہ ملکہ کے اندر وہ مذہبی عقیدت اور ذات قدسی صفات سرورِ کائنات علیہ الف الف تحیات کے ساتھ اور آپ کی ایک ایک چیز کے ساتھ وہ گہری عقیدت دیکھی جو کہیں نہیں دیکھی، جب کبھی اعلیحضرت اپنے آقا و مولیٰ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ فرماتے لب و لہجہ سے سننے والے کو محبت کی چاشنی معلوم ہوتی، میں نے ایک موقع سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ایمان، حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی محویتِ نماز اور حضرت سلطان المشائخ معین الدین اجمیری، سلطان الاولیا نظام الدین دہلوی، اور حضرت سید احمد گیسو دراز رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور کفار و مشرکین میں اُن کے اثر کے واقعات عرض کئے تو فرمایا کہ یہ تھے اللہ والے!

ملاقات کا سلسلہ سوا گھنٹہ تک جاری رہا، ۱۲ بجکر ۱ منٹ پر رخصت فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ "میں مل کر بہت محظوظ ہوا"

اسی دن کی شام کو میری واپسی کا وقت تھا، ساڑھے چار بجے دائرۃ المعارف نے مجھے پارٹی دی تھی، اکثر عمائد تشریف لائے تھے، چائے کے بعد میں نے دائرۃ المعارف کی اہمیت پر مختصر تقریر کی، نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات نے جوابی تقریر کی، اور میرے اور دار المصنفین کے حقیر خدمات کو بیحد سراہا،

نماز کے بعد سر مہاراجہ یمین السلطنۃ بہادر سے ملنے کے لئے اُنکی جاگیر مین لوال گیا، جو حیدرآباد سے باہر ۱۲ میل پر ہے، مولوی عبدالباری، مولانا مناظر احسن اور حکیم الشعراء امجد ساتھ تھے، سر مہاراجہ نے اپنی شرافت طبع اور وضع کی پابندی کی بنا پر جو ان خاندانی امراء میں وہ آخری مثال ہیں، تا لب فرش پیشوائی فرمائی، وہاں سے واپسی پر دیر ہو جانے کے سبب سکندرآباد میں ریل پر سوار ہوا اور رو رات اور ایک دن تک وہی خواب دیکھتا رہا، جو دکن کی سرزمین کے اس مختصر قیام کے زمانہ میں دیکھا تھا، ۲۰ شعبان المعظم کو اعظم گڈہ پہنچا، اور بدستور اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا،

رمضان المبارک کی تیسری تاریخ تھی کہ ڈاک کے ہرکارہ نے ایک زرد رجسٹری لاکر ہاتھ میں دی، کھولنے کے ساتھ آنکھین کھل گئیں کہ یہ اعلحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے دست خاص سے لکھا ہوا فرمان تھا، جس میں دارالمصنفین کے سابق تین سو ماہوار کے وظیفہ کے ساتھ سو روپیہ ماہوار کے مزید اضافہ کا حکم تھا، اور سیرۃ نبوی کی تکمیل کے بعد ایک شاہی صلہ کی بشارت تھی، آفتاب جلالت کی اس ذرہ نوازی سے آنکھین پرنور ہوئین اور دل مسرور، اس فرمان مبارک میں ذات قدسی صفات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن ادب کی ایک مثال یہ ہے کہ لفظ سیرۃ نبوی کو بھی سطر سے اوپر کرکے لکھا گیا ہے، تاکہ حسب آداب سلاطین تیموری ظاہر باطن کا آئینہ ہو، یہ فرمان دارالمصنفین کے تاریخی نوادر میں شامل ہوگا، اور آیندہ نسلوں کو شاہان اسلام کی علم نوازی کا نمونہ دکھائیگا،

یہ شاہانہ امداد و سرپرستی جو دست غیب سے ہماری قسمت مین آئی، ہمارے لئے سعادت کا سرمایہ اور عزت کی دستاویز ہے، علم وفن کی یہ قدرشناسی اور علم وفن کے خدمت گذارون پر یہ شاہانہ نوازش آج ساری دنیا مین صرف خانوادۂ آصفی کی تاریخ پیش کرسکتی ہے، دعا ہے کہ اللہ عزّ وجلّ اس کو علم وفن اور دین وملت کی سرپرستی کے لئے ہمیشہ قائم رکھے اور اُس کے اقبال کا آفتاب ہمیشہ یونہی چمکتا رہے،

تا جہاں باشد و ایں گنبد گرداں باشد

دہر فرمانبر عثمان علیخان باشد

مقالات

ہماری زبان

بیسوین صدی مین

"یہ مضمون نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک ادبی مجلس کی صدارتی تقریر کے طور پر لکھا گیا تھا، مگر پھر خیال بدل گیا، اب وہ کچھ اضافہ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے"

سید سلیمان

ہمارے ادبی محققون نے اپنی زبان کی پرانی تاریخ کی تحقیق اور ترتیب مین جو کاوشیں کی ہین، وہ شکریہ کے قابل ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل سے قطع نظر کرکے حال پر توجہ کرین،

اسمین شک نہین، کہ اس صدی کے آغاز سے لیکر آجتک ہماری زبان نے جو ترقی کی ہے، وہ کسی پچھلی صدی کی ترقیوں سے زیادہ ہے، کسی زندہ زبان کے جو اجزاء اور عناصر آج سمجھے جاتے ہیں یعنی اخبار رسالے چھاپخانے کتابیں، کتبخانے ان میں سے ہر ایک چیز کی حیثیت سے اس زبان نے اس حد تک ترقی کی ہے، جو بالاتر اور تسلی کے قریب قریب ہے،

پچھلی صدی کے خاتمہ اور اس نئی صدی کے شروع میں ملک والوں میں اور خاصکر مسلمانوں میں اس زبان کی ترقی کے وجوہ یہ نظر آتے ہین،

۱۔ سرسید کی تحریک،

۲- تعلیم کی عام اشاعت،

۳- مذہبی تحریکات،

۴- اردو ہندی کے جھگڑے،

۵- سیاسی تحریکات،

۶- جامعۂ عثمانیہ کا قیام،

۷- قومی زبان کا تخیل،

۸- آمد و رفت کی سہولت،

سرسید کی تحریک سرسید کی علمی و تعلیمی تحریکات کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا، کہ ہماری زبان لکھنؤ اور دہلی کی دیوارے باہر نکلی، اور ملک کے ہر گوشہ میں ہر لکھے پڑھے شخص کو اس زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی اجازت ملی، اور ہر جگہ اس کا چرچا پھیلا، نئی نئی کتابیں، جو صاف ستھری سادہ اردو میں لکھی جاتی تھیں وہ لوگوں میں اس زبان میں لکھنے پڑھنے کا ولولہ پیدا کرنے لگیں، اور ہر جگہ اُن کی نقالی ہونے لگی، اور کچھ دنوں کے بعد نقل نے اصل کی کیفیت پیدا کرلی،

ابتدائی تعلیم کی عام اشاعت ابتدائی تعلیم کی زبان حکومت نے ملک کی زبان کو قرار دیا، اسلئے دیہات سے لیکر شہروں تک ابتدائی تعلیم کے جو مکتب اور اسکول کے درجے کھولے گئے، ان کے لئے نصاب کی کتابیں اردو میں لکھی اور لکھوائی گئیں، اور وہ بچوں کے نصاب میں داخل ہوئیں، اس سے زبان کی ترقی اور اشاعت کو بہت بڑی مدد ملی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کام پنجاب نے اور اس کے بعد ہمارے صوبہ نے کیا،

مذہبی تحریکات اردو زبان کی اشاعت میں مذہبی تحریکات کو بہت بڑا دخل ہے، ردِ بدعت کی جو تحریک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے اٹھی تھی، اس نے رفتہ رفتہ پورے ملک کو چھا لیا، اسی کی خاطر قرآن و حدیث کے ترجمے ہوئے، عقائد پر کتابیں لکھی گئیں، ردِ بدعات پر رسالے تالیف ہوئے، اور

توحید خالص کی اشاعت پر مسلسل تحریریں چھپتی رہیں، اس سلسلہ کی پہلی کڑی شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمۂ قرآن، اور شاہ اسمٰعیل صاحب کی تقویۃ الایمان ہے، اور ان کے بعد انکے ساتھیوں اور ہم خیالوں نے عوام کی درستی کے لئے عوام تک پہنچنے کے لئے اسی زبان کو اپنی تحریکات کا ترجمان بنا لیا، اس کا نتیجہ یہ ہے، کہ آج ہماری زبان میں ہر علم و فن سے زیادہ مذہبی علوم و مسائل کی کتابیں ہیں،

اردو ہندی کے جھگڑے، اردو اور ہندی کی لڑائی بھی پچھلی صدی کے خاتمہ اور نئی صدی کے شروع میں شروع ہوئی، نئی صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱ء) تھا، کہ لکھنؤ کے پرانے گنگا پرشاد ورما لائبریری میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو زبان کی حمایت کا جلسہ ہوا تھا، اسوقت مرحوم نے اردو کی طرف اشارہ کرکے یہ مصرع پڑھا تھا ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

قضا کار کیا ہوا کہ اس دھوم دھام میں مردہ عاشق کفن پھاڑ کر تابوت سے نکل کر اٹھ بیٹھا، اور آج وہ "عودِ شباب" کی اس منزل میں ہے کہ ہم آپ اسوقت انکی برات میں شامل ہیں،

غرض اس اردو ہندی کے جھگڑے نے مسلمانوں کو اس زبان کی حفاظت اور ترقی کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور اُن ٹھوس علمی کاموں کا سلسلہ بڑھا، اور پھیلا، جو گذشتہ صدی میں صرف سرسید کی تعلیمی تحریک کے دائرہ میں محدود تھا،

سیاسی تحریکات ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ملک میں جو مختلف سیاسی تحریکیں پھیلیں، انھوں نے اس زبان کی اشاعت میں بہت بڑی مدد دی، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم، خلافت اور کانگریس تحریکوں کے بعد دیگرے تحریکوں نے اخبارات کی اشاعت، روزانہ اخباروں کی پیداوار اور ملک کے صوبہ صوبہ میں جلسوں کی کثرت، اردو بولنے والے رہنماؤں کی تقریریں، اور ہر صوبہ کے ممبروں کے بار بار اجتماع

اور جلسوں کے تو بر تو انعقاد نے اس زبان کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا، اور اردو کے بہترین مقرروں
محرروں اور قومی شاعروں کو پیدا کر دیا، اور ترک موالات نے یہ سمجھا دیا کہ بدیسی زبان کو چھوڑ کر اپنی زبان
اختیار کرنا ترقی کا راز ہے،

جامعہ عثمانیہ کا قیام، ہمارے ملک میں جب نئی تعلیم کا آغاز ہوا، تو پہلے پہلے اردو ہی تعلیم کا ذریعہ بنی تھی چنانچہ
۱۸۵۷ء سے پہلے ڈاکٹری کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی دلی کالج وغیرہ قدیم وجدید طرز کے جو نئے مدرسے
بنائے گئے تھے، ان میں ریاضیات اور طبعیات کی تعلیم بھی دیسی زبان میں دیجاتی تھی، مگر دفعۃً انگریزوں
نے تعلیم کا رخ بدل دیا، اور انگریزی کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا، اور انتہائی تعجب ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی کے بانی
سرسید احمد خان نے بھی بالآخر یہی سمجھا اور سب کو سمجھایا کہ جدید علوم کا سمندر اردو کے کوزہ میں نہیں سما سکتا،
یہ تخیل کچھ اس مضبوطی سے دلوں میں جم گیا کہ اسکول کالج، یونیورسٹی، اور جدید علوم وفنون کا تخیل انگریزی
کے سوا کسی اور زبان میں آتا ہی نہ تھا، یہ حالت ۱۹۱۶ء تک قائم رہی، ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں ایک
یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا گیا، جس میں تعلیم کا ذریعہ اردو ہو، اس تجویز کے بلند بانگ مدعیوں کو تو سب
جانتے ہیں، مگر وہ خاموش ہستی جس کے دماغ میں یہ تجویز سب سے پہلے آئی، اور جس نے حیدرآباد کے ارباب
بست وکشاد کو سمجھا کر اس کے عملدرآمد پر آمادہ کیا، اور اس کے ابتدائی مدارج میں اسکی رہنمائی کی اسکو
بہت کم لوگ جانتے ہیں، اور وہ مولینا حمید الدین صاحب مرحوم سابق صدر دار العلوم حیدرآباد دکن ہیں
اللہ کی رحمت اُن پر ہو، شروع شروع تو سب کو بڑا اچنبھا ہوا، مگر آہستہ آہستہ تعجب حیرت سے اور حیرت
امکان سے اور امکان عمل سے بدل گیا، دار الترجمہ قائم ہوا، اور جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، ہزاروں
اصطلاحات پیدا ہو گئے، سینکڑوں کتابیں ترجمہ ہوئیں، اور اب اس کا وجود مادری زبان میں تعلیم کے
امکان اور فائدہ کی مستقل اور مجسم دلیل ہو گئی، دوسرے صوبوں پر بھی اس کا اثر پڑا، جامعات میں اردو
کو مناسب جگہ ملنے لگی، اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ آگے بڑھنے لگا،

قومی زبان کا تخیل، تعلیم جدید اور قومی تحریکات کی ترقی نے یہ نکتہ بتا دیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں
اور صوبوں کو ایک کرنے کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے جو ہماری قومی زبان بن سکے، جہانتک
مسلمانوں کا تعلق ہے، اردو سے متعلق کی محدود زبان اب ہندوستانی بنکر ہندوستان کی عام زبان بن چکی ہے
ہندوؤں کا سنجیدہ طبقہ بھی اس زبان کو کم از کم پنجاب یوپی اور بہار میں عملاً اپنی قومی زبان سمجھتا ہے، خواہ
وہ اسکو کسی خط میں لکھتا ہو، اس تخیل نے ہماری زبان کی ترقی میں اچھی خاصی مدد کی، اور دور دست
صوبوں میں جہاں مقامی بولیاں بھی بولی جاتی ہیں، وہ قومی زبان کی حیثیت سے قبول کیجاتی ہے،

آمد ورفت کی سہولت، ہم نے اس زبان کی ترقی میں اس ایک اہم سبب کو اب تک بھلا دیا، جسکو پہلے
بتانا چاہئے تھا یعنی ملک کے دور دراز حصے آج ڈاک اور آمد ورفت کی سہولت کی بنا پر گھر آنگن بن گئے
ہیں، پنجاب کے لوگ بنگال، اور بنگال کے لوگ بہار اور یوپی میں، سندھی گجرات، اور گجراتی سندھ میں
آجا رہے ہیں، ایک شخص پشاور سے کلکتہ اس طرح پہنچتا ہے، کہ اسکو سرحد پنجاب، متحدہ، بہار اور بنگال
پانچ صوبے دو دن میں طے کرنے پڑتے ہیں، ہر اسٹیشن پر اسکو اترنا چڑھنا، لینا دینا، ملنا جلنا، اور بولنا چالنا
پڑتا ہے، اور اگر ہماری خوش قسمتی سے طرفین میں سے ایک یا دونوں انگریزی کا کوئی حرف نہیں جانتے
تو یہی ہندوستانی اس سفر میں اُن کی زندگی کا سہارا بنتی ہے، اور لازمی طور سے مشترک ہندوستانی
زبان کی ترقی کا ہر قدم اس آمد ورفت کی سہولت سے ہر روز آگے بڑھ رہا ہے،

غرض یہ اسباب ہیں جنھوں نے ایک مشترک ہندوستانی زبان کے تخیل کو واقعہ بنا دیا ہے، اور
وہ بولی جو کبھی کسی ضرورت سے شروع ہوئی تھی، اب پورے ملک کی زبان ہو گئی ہے،

زبان کی ترقی کے اصول اور معیار، بیسویں صدی میں ہندوستانی نے جو ترقی کی ہے، اس کے جاننے کا معیار
ہمارے پاس یہ ہے، کہ ہم دیکھیں کہ وہ تعلیمی، اخباری، کتابوں کی تعداد کتبخانوں کی وسعت اور جغرافی پھیلاؤ
کے لحاظ سے کہاں تک بڑھی ہے، ذیل کے صفحوں میں ہم اسی معیار پر اس زبان کی ترقی کو جانچتے ہیں، گو

اعداد و شمار کے موجود نہ ہونے کے سبب سے یہ روداد پوری مکمل نہیں، تاہم یہ ادھورا بیان بھی اس قابل ضرور ہے کہ ہم اسکو سنکر اپنی مسرت کا اظہار کریں،

تعلیمی ترقی، اس مدت میں ہماری زبان دلّی اور لکھنؤ کے حدود سے نکل کر ملک کے گوشہ گوشہ تک پہونچ گئی ہے، پشاور سے لیکر کلکتہ تک وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں کے اسکولوں اور مکتبوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں میں اسکی تعلیم دیجاتی ہے، اکثر کالجوں میں اسکی ایک کرسی ہے، اور ایم اے کے امتحانوں میں اسکے ادبیات میں تکمیل کی سند دیجاتی ہے،

پنجاب یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر مقرر ہیں، اور ان میں ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اسکی تعلیم دیجاتی ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ تعجب کی بات ہے کہ ابھی تک اس زبان کو ان ہی شہروں کی تعلیم گاہوں میں اس اعتبار اور استناد کی عزت نہیں ملی ہے، جو اس زبان کے مولد و منشا ہیں یعنی لکھنؤ، دلّی اور آگرہ کی یونیورسٹیوں میں اسکی یہ علمی حیثیت ابھی تک تسلیم نہیں ہوئی ہے، اور اس موقع پر حضرت عیسیٰؑ کے اس فقرہ کی سچائی پر ایمان لانا پڑتا ہے، کہ "نبی بے عزت نہیں، مگر اپنے وطن میں"

کیا یہ سن کر حیرت نہ ہوگی، کہ جاپان میں مشرقی زبانوں کی جو سرکاری درسگاہ ہے، اس میں ہندوستانی کی تعلیم بھی باقاعدہ دیجاتی ہے، دلّی کے نور الحسن برلاس صاحب اس کے پروفیسر ہیں، ابھی علیگڈہ کی گذشتہ اردو کانفرنس کے موقع پر اس درسگاہ کے ایک جاپانی استاد پروفیسر گامو پہلی دفعہ ہندوستان آئے تھے، اور علی گڈہ کی کانفرنس میں موجود تھے، اور اردو خاصی بولتے اور لکھتے تھے، روس میں بھی اسکی تعلیم کا اہتمام ہے، اور برانکوف صاحب نے اردو کے سلسلے لکھے ہیں، لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھی اسکی تعلیم کا بندوبست ہے، اسوقت گراہم بیلی صاحب لندن یونیورسٹی میں اسکے پروفیسر ہیں، پیرس یونیورسٹی میں اس زبان کی پروفیسری بہت پرانے زمانہ سے ہے، ڈی ٹاسی صاحب کا نام

ہماری زبان کی تاریخ میں نہایت ممتاز ہے،

ابھی جامع ازہر کے مصری وفد کی زبانی یہ خوشخبری بھی آپ کو مل چکی ہے، کہ عنقریب جامع ازہر میں ہندوستانی زبان سکھانے کے لئے ایک درجہ کھولا جائے گا، لیکن ان سب سے زیادہ اسکی تعلیمی ترقی کی بنا یہ ہے کہ دکن میں جو ایک معنی میں اس کا جنم بھوم ہے، اسکی پوری یونیورسٹی قائم ہے، جہاں ہر علم و فن کی تعلیم کا وہ تنہا ذریعہ ہے،

ہمارے عربی مدرسے جو خیبر کے دروں سے لیکر بحر ہند کے کناروں تک پھیلے ہیں، ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہے، جسکو اُن کے ہر دیس کا طالب علم یکساں سمجھتا ہے،

اردو کے مکتب اور ابتدائی مدرسے گاؤں اور دیہاتوں میں قائم ہیں، لیکن یہ افسوس کے قابل ہے کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے انکو وہ امداد نہیں ملتی جسکی وہ مستحق ہیں، تاہم وہ اس زبان کے بولنے والوں کی ذاتی کوششوں سے جیسے تیسے چل رہے ہیں، مجھے مدراس کے بہت سے دور دراز قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے خاصی اردو بولتے اور پڑھتے تھے، لانور، وانمباڑی، عمرآباد، اور ترچناپلی میں اردو زبان کے مدرسوں اور مکتبوں کا معائنہ کیا ہے اور کامیاب پایا ہے، میسور میں بھی، اردو اسکول، اور اردو ٹریننگ کلاسز ہیں، مسلم یونیورسٹی نے ان کیلئے جنکی مادری زبان اردو نہیں، اردو کا کورس مقرر کیا ہے اور وہ پڑھایا جاتا ہے،

ہندوستان کی جغرافی وسعت، اسی بیان سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں، کہ آپ کی زبان پورے ملک میں کس طرح پھیلی ہوئی ہے، مسلمان علماء اور واعظ جو عام طور سے یوپی اور دلّی اس کے اطراف یا پنجاب کے ہوتے ہیں وہ بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ، بمبئی، سندھ اور مدراس تک جاتے ہیں، وہ ہندوستانی بولتے ہیں، ان کی تقریروں اور وعظوں میں ہزارہا لوگ شریک ہوتے ہیں، اور مقرر و واعظ کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہاں کی عام اسلامی کانفرنسیں، اور انجمنیں اسی زبان میں تجویزیں لکھتی ہیں، تقریریں

کرتی ہیں، اور رودادین چھاپتی ہیں، سرحد کی پہاڑیوں سے لیکر بحر ہند کے کناروں تک ہندوستانی کے اخبار و
رسالے چھاپے جاتے ہیں، اور پڑھے جاتے ہیں، ہندوستان کے ہر گوشہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے
اور کہیں بھی مجھے اپنی زبان کی بے زبانی کا اقرار کرنا نہیں پڑا ہے،

ملک سے باہر جہان کہیں بھی نکلا، سیاح کو اس زبان کے نقش قدم ملتے گئے، کابل گیا تو وہان
کے بادشاہ سے وزرا، علماء اور ادباء تک اس زبان مین بولتے یا سمجھتے ہوئے ملے، عراق، حجاز اور بیت المقدس
(فلسطین) میں ہندی زائروں اور حاجیوں کی آمد و رفت کے سبب سے اسکے بولنے والے اور سمجھنے والے مین
خصوصاً حجاز میں تمام دوسری اسلامی زبانوں سے زیادہ یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، عدن میں نہ صرف یہ
بولی جاتی ہے، بلکہ یہاں ہندیوں کے لئے ہندوستانی کے مکتب اور اسکول ہیں، یمن کی ریاست مکلا
میں ملاحوں کی زبان سے اردو سنی، افریقہ کے ایطالوی مقبوضہ مصوع میں اترا، تو گجراتی تاجرون
سے ہندوستانی ہی میں بات چیت ہوئی، اسکندریہ کے بازار میں اس کے بولنے والے پائے، سوئز کے
ملاحوں کو کام چلاؤ اردو بڑی تیزی سے بولتے سنا، کیمبرج یا آکسفورڈ کی انڈین مجلس میں بھی جہیں
ہندوستان کے ہر صوبہ کے ہندو مسلمان، پارسائی، عیسائی طالب علم تھے، انگریزی کے بعد ہندوستانی
ہی زبان عام اور مشترک زبان پائی، اور اسی میں تقریر کی،

ادھر ایشیاے وسطی سے ایشیاے اقصی تک اردو زبان کا سکہ چلتا ہے، بخارا، خیوا، قندھار، غزنی،
کابل، سمرقند، بدخشان اور کاشغر، اور چین، جاوا، ملایا، اور سنگاپور تک کے طالب علم ہمارے عربی مدرسون
میں تعلیم پاتے ہیں، ندوہ لکھنو، دار العلوم دیوبند، امینیہ دہلی، جامعہ ملیہ دہلی، مدرسہ عبد الرب دہلی، مدرسہ
عالیہ رام پور، اور جامعہ عربیہ ڈابھیل گجرات وغیرہ مین مختلف اسلامی ملکوں کے باشندہ لڑکے پڑھتے ہیں
اور یہاں چند سال کے قیام میں ہندوستانی زبان اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں، اور اسکو تحفہ کے طور پر اپنے ملکوں میں لیجاتے ہیں
ترکستان و خراسان و کابل کے طالب علم پہلے بھی ہندوستان کے عربی مدرسوں میں پڑھنے آتے تھے

گو چونکہ ان مدرسوں میں ہندوستانی زبان کی ادبی تعلیم کا شوق نہ تھا، اسلئے وہان کے طالب علم بول چال
کی زبان تو سیکھ لیتے تھے، مگر اس زبان میں لکھنے پڑھنے سے عاری رہتے تھے، لیکن دار العلوم ندوہ، اور
جامعہ ملیہ نے چونکہ تعلیمی مضامین مین اسکی اہمیت بھی رکھی ہے، اسلئے اسکے نتیجے سامنے ہیں، ندوہ میں مولوی
عبد الرحمن صاحب کاشغری نے اردو ضرب الامثال پر بہت سے مضامین لکھے ہیں، اور مثل مادری زبان
کے اسکو بولتے ہیں، جامعہ میں چین کے بدر الدین نے اردو زبان ایسی سیکھی، کہ چین کے مسلمانوں پر خود اپنے
قلم سے کتاب لکھی ہے، اور جو دار المصنفین میں چھپی ہے، ابھی میرے پاس ختن کے ایک ندوی طالب علم کا
خط آیا، جسکو پڑھکر مجھے حیرت ہوئی، ندوہ کے ایک جاوی طالب علم عدنان نے اتنی اردو سیکھ لی ہے، کہ میرے
رسالہ رسول وحدت کا جاوی میں ترجمہ کیا، اور اب خطبات مدراس کا ترجمہ کر رہا ہے، محمد حسن مالدیپ، مالدیپ
کے رہنے والے ہیں ندوہ سے پچھلے سال فراغت پائی، اردو خوب سیکھ لی، ابھی چند روز ہوئے مالدیپ سے انکا اردو
خط آیا، تو دیکھکر بڑا تعجب ہوا، سوماترہ کا ایک نوجوان محمد صابر ندوہ میں ہے، جو ایسی اردو جانتا ہے
کہ اردو کتابون اور رسالوں کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیتا ہے،

ابھی ہمدرد جامعہ دہلی میں ایک مضمون کے سلسلہ میں یہ اطلاع نکلی ہے:-

"جامعہ میں بہت سے غیر ملکیون نے اردو خوب سیکھی، ابھی چند سال پہلے جزیرہ مالدیپ کے ایک طالب علم
محمد دیدی یہاں تھے، یا تو وہ اردو کا ایک حرف نہیں جانتے تھے، یا رنگین عبارتیں لکھنے لگے،
کالج میں ایک جاوی ہیں، محمد عثمان سوید، وہ جماعت کا سارا کام اردو میں کرتے ہیں، معاشیات،
تاریخ، دینیات وغیرہ مضامین خالص اردو میں لکھتے ہیں، اور بدر الدین چینی تو ان سب کے
سردار ہیں، ...... محمد بن عبد القیوم افریقی بھی مدرسہ ابتدائی کے بڑے ہوشیار ہونہار
طالب علم ہیں، ان پر بھی یہ شبہہ نہیں ہو سکتا، کہ وہ افریقی ہیں،"

(دسمبر ۱۹۳۶ء ص ۱۲)

گذشتہ علی گڈھ اردو کانفرنس کی صدارتی تقریر میں نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمایا تھا:

"جنوبی افریقہ سے حال میں ایک ڈیلیگیشن آیا تھا، اُن سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا، کہ جو ہندوستانی لوگ اس ملک میں آباد ہیں، وہ ہندوستانی بولتے ہیں، مارشس میں بھی ہندوستانی بولتے ہیں"

مارشس کا مجھے بھی تھوڑا سا ذاتی تجربہ ہے، ۱۹۲۰ء کی جولائی میں میں فرانس کی صحت گاہ وشی میں تھا، میں فرانسیسی سے بالکل نابلد تھا، اتفاق دیکھئے کہ اس انجان شہر میں مجھے مارشس کے دو ہندو طالب علم ملے، جو پیرس میں ڈاکٹری پڑھنے آئے تھے، ان کے مورث غدر کے زمانہ میں مہاراشٹر سے بھاگ کر جزیرہ میں چلے گئے تھے، وہ اتنے دنوں اور نسلوں کے بعد بھی ہندوستانی زبان سمجھ لیتے تھے،

مارشس میں اردو کے اسکول بھی ہیں، اور علما، اور واعظ وہاں جاکر اسی زبان میں تقریر کرتے ہیں یہی دوسرے جزائرِ ہند کا بھی حال ہے، رنگون اردو زبان کا ان اطراف میں مرکز بن رہا ہے، یہاں کے بازاروں میں ہندوستانی عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور وہاں ہندوستانی کے اسکول اور کتب خانے قائم ہیں، برہما کے ایک ہندوستانی مضمون نگار، (سکریٹری مسلم کمیٹی رنگون) کا یہ بیان دلچسپی سے سنا جائے گا:۔

"یہاں کے اکثر شہروں اور خصوصاً رنگون کی شہری زبان اردو ہے، کسی ملک کا رہنے والا ہو شہر میں داخل ہونے کے ساتھ اردو کا جاننا ضروری ہے، وہ ہر بازاری چیز کے لئے اردو ہی میں گفتگو کرسکتا ہے، اکثر غیر ممالک کے لوگوں خصوصاً ہندوستان کی ہر زبان بولنے والی قوم کا خلط ملط جسقدر برہما میں ہے، اس قدر ہندوستان کے کسی شہر میں آج تک ہو سکا، اور یہی وجہ ہے کہ اسی ملک کی بدولت ہندوستان کے ان مقامات تک اردو پھیل گئی، جہاں شاید ایک عرصۂ دراز تک پھیلانا سخت مشکل تھا، مدراس، کوکناڈا، ترچناپلی، ناگور وغیرہ

جیسے مقامات کے لوگ برہما کی کثرت سے آمدورفت کی وجہ سے اسقدر آسانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں، کہ آج وہاں کے جس دیہات میں چلے جایئے، عام طور پر اردو جاننے والے ملیں گے، چٹاگانگ کی بہت بڑی آبادی جس کا برہما سے تعلق ہے، اردو سے مانوس ہی نہیں، بلکہ اردو کی معاون و مددگار رہی ہے، مالابار میں بھی اسی ملک کے بدولت اردو کی کافی اشاعت ہو چکی ہے،

...... یہاں چینی قوم بھی کثرت سے آباد ہے، اس کا ایک ایک بچہ اردو جانتا ہے، اور بولتا ہے، یورپین ممالک کے لوگ بھی کثرت سے موجود ہیں، اور ہندوستانی ہی زبان میں بازاری کاروبار کرتے ہیں، (اجمل بمبئی یکم دسمبر ۱۹۳۶ء)

ہندوستان کے تین احاطے، مدراس، بنگال اور بمبئی ایسے ہیں، جہاں ہندوستانی زبان کے علاوہ صوبائی بھاشاؤں کا بھی چلن ہے، مگر یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے، کہ ان مقامی بولیوں کے ساتھ ساتھ ملک کی یہ مشترک زبان بھی ہر جگہ ترقی کرتی جاتی ہے، مجھے احاطۂ مدراس کے مختلف شہروں، مدراس، بنگلور، ترچناپلی، آمبور، میسور وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا، اور ہر جگہ اردو میں تقریریں ہوئیں، اور عموماً ہوتی ہی رہتی ہیں، اور وہ اچھی طرح سمجھی جاتی ہیں، اور شمالی ہند کے اردو اخبار، رسالے اور تصنیفات وہاں پڑھی جاتی ہیں، بلگام جیسے دور دراز علاقہ میں جو مدراس اور بمبئی کی سرحد پر ہے، اردو کا رواج کافی ہے، اور اردو کے مدرسے اور کتب خانے قائم ہیں،

بمبئی جانے کا اتفاق ہر شخص کو ہوتا ہوگا، وہاں دیکھا گیا ہوگا، کہ صوبہ کی مختلف بولیوں مرہٹی، کنڑی اور گجراتی کے ساتھ بازاروں اور پبلک مقاموں پر ہندوستانی ہی کا قبضہ ہے، یہاں کارپوریشن کی طرف سے اکثر محلوں میں اردو کے میونسپل اسکول جاری ہیں، مہاراشٹر کے مرکزی شہر پونہ میں میرا دو سال قیام رہا، ہر جگہ نظر آیا، کہ بازاروں پر اور مشترکہ مقاموں پر سمجھنے بوجھنے کا واحد ذریعہ اردو ہی ہے، یہاں اردو کا ایک ٹریننگ اسکول بھی ہے، اور اردو اسکولوں کے لئے الگ انسپکٹر بھی مقرر ہیں،

یہان پر اپنے قیام پونہ کا ایک لطیفہ یاد آیا، دکن کالج میں میرے شریک کار ایک مرہٹہ برہمن پروفیسر تھے، دوپہر کی راحت کے گھنٹہ میں ہم لوگ ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے، ہمارے ساتھ دوسرے پروفیسروں اور چپراسیوں کی مادری زبان مرہٹی تھی، مگر جب ان پروفیسر صاحب کو چپراسیوں پر غصہ آتا تھا تو وہ اردو میں آتا تھا، اُن سے اسکی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا؛ مرہٹی بڑی پیاری زبان ہے، اس میں غصہ کرتے نہیں بنتا، اور اردو زبان ملٹری لنگویج ہے، اس میں غصہ کرتے خوب بنتا ہے،

گجرات کے مسلمانوں میں گجراتی کے ساتھ اردو زبان بھی بخوبی رواج پذیر ہے، اور گجراتی ہندو بھی اسکو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں، گجرات کے عام شہروں مین بلکہ دیہاتوں تک میں اردو لکھنے پڑھنے کا رواج ہے، شہر بڑودہ، جونا گڑھ، مانگرول، بھروچ، احمد آباد، سورت، راندیر، وغیرہ مقامات میں اور خصوصًا سورت اور اُس کے آس پاس میں ہندوستانی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے یعنی باقاعدہ سیکھے بغیر اردو بولتے جاتے ہیں، اور گھروں میں بولی جاتی ہے،

بنگال میں بنگالیون کی واحد زبان بنگالی ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، مگر ہر شخص جا کر دیکھ سکتا ہے، کہ بنگال کے دار الحکومت کلکتہ پر ہندوستانی کا قبضہ ہے، بنگال کے پرانے متمدن شہروں مرشد آباد اور ڈھاکہ میں اردو گویا مادری زبان ہے، چاٹگام میں ان سے کم مگر پھر بھی ہندوستانی زبان سمجھ لیجاتی ہے، بنگال مین عربی مدرسے بکثرت ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے، کہ کم سے کم ساٹھ ہزار بنگالی طالب علم وہان عربی پڑھتے ہیں، اور ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہی ہے، ہم کو اس کا علم ہے کہ بنگالی مسلمانوں کو بھی اپنی صوبائی زبان سے نہایت سخت محبت ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی بولنے پر مجبور رہتے ہیں، ہندوستان کے اکثر عربی مدرسوں میں بنگالی طالب علموں کا بڑا حصہ آیا کرتا ہے، اور یہیں وہ چند سال رہ کر تعلیم پوری کرتا ہے، اس کا اثر ہے کہ وہ گھر جا کر بھی اسکو نہیں بھولتا، بنگال میں بہت سے اردو کے ایسے نامور شاعر اور ادیب ہیں، جو کسی حیثیت سے اس صوبہ کے اردو شاعروں

اور ادیبوں سے کم نہیں ہیں،

راجپوتانہ

راجپوتانہ میں اجمیر کا شہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ سارے کا سارا اردو بولتا ہے، اسکی پاس والی ریاستوں کی سرکاری زبان اردو رہا کی ہے، وہان کے رہنے والے یا تو ٹھیٹھ ہندوستانی بولتے ہیں، یا ایسی بولیاں جو ہندوستانی سے بالکل ملتی جلتی ہیں، اور دہلی کے اثر سے متاثر ہیں، ٹونک کی مادری زبان اردو ہے، وہاں کے نواب اور امرا اس زبان کے شاعر ہوئے ہیں، وہان کے عام شرفا میں بھی اس زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب ہیں،

دوسری ریاستوں میں بھی ہماری زبان کا سکہ چلتا ہے، جے پور میں بھی یہ بولی جاتی ہے، ریاست جے پور کے محکمہ تعلیمات نے تمام سرکاری اور امدادی مدرسوں میں اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے[1]، مارواڑ وغیرہ میں جو مقامی بولیاں ہیں وہ ہندوستانی ہی کی ایک قسم ہین، گو لہجہ میں اس سے زیادہ کڑی ہی،

ہندوستانی بولنے والون کی تعداد

اردو کی جغرافی وسعت کے سمندر میں بہتے ہوئے خدا جانے ہم کہان سے کہاں چلے آئے، کہنا تو یہ تھا کہ اردو کی ترقی کا آغاز اس صدی کے آغاز کیساتھ ہوا اور سال تیسال ہر قدم کیساتھ اس کا قدم آگے کو بڑھتا جاتا ہے، اس کے جانچنے کا سب سے آسان ذریعہ ہندوستانی بولنے والوں اور سمجھنے والوں کی تعداد پر سرسری نظر ڈالنا ہے،

نواب مہدی یار جنگ بہادر اردو کانفرنس علیگڈہ (۲۴-۲۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء) کے صدارتی خطبہ میں فرماتے ہیں،

"سائمن کمیشن رپورٹ کے دیباچہ میں ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے"، (روداد مذکور ص ۵۳)

انڈین نیشنل کانگریس کے محترم صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے،

[1] کانفرنس گزٹ علیگڈہ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

"جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں پڑتے لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴ کرور سے کم نہیں، اسکے علاوہ اس کے سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے، جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں، یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے، اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ دونوں زبانوں کے خزانوں سے یہ مالامال ہو سکتی ہے"

(اردو ترجمہ ۲ ص ۲۹۹ و ص ۳۰۰)

مدراس، بنگال اور بمبئی کی امید گاہیں

ہندوستانی زبان کی رفتار ترقی کے لئے سب سے کٹھن منزلیں بمبئی، مدراس، اور بنگال کی ہیں، بنگال میں ڈھاکہ یونیورسٹی، مدرسۂ عالیہ کلکتہ، اور عربی کے دوسرے مدرسوں کے ذریعہ سے یہ زبان اہل صوبہ کی مخالفت کے باوجود آگے بڑھ رہی ہے، بمبئی میں انجمن کا لج ہندوستانی ادبیات کی ترقی کے لئے کوشاں ہے، اور رفتار کامیاب نظر آرہی ہے، مدراس میں جامعہ دارالسلام عمر آباد سے بہت کچھ امیدیں ہیں، میسور میں بنگلور اردو کا خاص مرکز ہے،

ابھی حال میں ملیبار میں ایک انجمن اصلاح اللسان کے قیام کی خبر ملی ہے، جو چھ سال ہے ملیبار کے گیارہ لاکھ مسلمانوں کی قومی زبان اردو بنانے کے لئے کوشاں ہے، اس انجمن کی کوششوں سے وہاں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں میں اردو کا ذوق پیدا ہو چلا ہے، اور اب وہاں سے الجلسان نام ایک ادبی رسالہ کی اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے،[۱]

بہار اور سرحد

صوبہ بہار اطراف دہلی اور یوپی کے بعد اردو کا تیسرا مرکز ہے، اور اردو یہاں کی مادری زبان ہے، تاہم اکثر صاحبوں کو یہ معلوم ہوگا، کہ گذشتہ صدی کے خاتمہ کے قریب اس زبان

[۱] اخبار قوم بنگلور ۲۶ر فروری ۱۹۳۷ء،

کا رسم الخط سرکاری عدالتوں سے خارج کر دیا گیا تھا مدتوں کی کوششوں کے بعد آنریبل سر فخرالدین مرحوم کے عہد وزارت میں یہ حکم منسوخ ہوا، اور پٹنہ کمشنری میں اردو رسم الخط کی سرکاری اجازت حاصل ہو گئی، اس اجازت کا اس صوبہ میں اردو زبان کی ترقی پر بہت اچھا اثر پڑا ہے، کئی اخبار اور رسالے نکلے، اور پبلک شوق بھی نمایاں ہوا، پچھلی عارضی وزارت میں بعض بنگال کرتے ہوے اضلاع کے علاوہ سارے صوبہ کو اردو خط کی اجازت مل گئی کانگریس کی نئی وزارت نے بھی اس اجازت کو قائم رکھا ہے، اور اب یہ صوبہ بھی بدستور سابق اردو کا گھر بن رہا ہے،

صوبہ سرحد کی مادری زبان پشتو ہے، تاہم ہندوستانی وہاں کا ہر شہری باشندہ بولتا اور دیہاتی باشندہ سمجھتا ہے، پچھلے دنوں سر عبد القیوم کی وزارت میں اردو رسم الخط اس صوبہ کا سرکاری خط قرار دیا گیا ایک ادبی انجمن اور اسلامیہ کالج کی فضا اس زبان کی ترقی کے لئے ساز گار ہے،

ابھی کوہاٹ میں ایک بزم اردو کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا مقصد اس صوبہ میں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اشاعت ہے،[۱] (باقی)

[۱] احسان لاہور ۲ر مارچ ۳۷ء ص ۷،

تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم

للامام ابی المظفر طاہر بن محمد الاسفرائنی

از جناب افضل العلماء مولینا عبدالحق صاحب پروفیسر عربی مدراس،

موصوف مدراس کے ممتاز فضلار میں ہیں، آجکل انگلستان میں ڈاکٹری کی سند کے لئے اپنا مقالہ دیوان ابن سنار الملک پر تیار کر رہے ہیں،

"س"

آکسفورڈ کے مشہور کتب خانہ بوڈلین میں اس فارسی تفسیر کا ایک نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے، اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ فہرست نگار نے اس کو عربی تفسیروں کی فہرست میں غلطی سے داخل کر دیا ہے، اسی وجہ سے ڈاکٹر ایتھے نے جب بوڈلین کے فارسی مخطوطات کی فہرست ترتیب دی، تو اس کتاب کو قطعاً نظر انداز کر دیا، عربی مخطوطات کی فہرست میں امام ابوالمظفر طاہر بن محمد الاسفرائنی، کی تاریخ وفات ۴۷۱ھ درج ہے، اور یہ سنہ غالباً کشف الظنون (فلوگل والانسخہ) سے منقول ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر کی طرف چنداں توجہ نہیں کی گئی، کیونکہ نویں صدی ہجری تک فارسی زبان میں قرآن کی متعدد تفسیریں لکھی جاچکی تھیں یہ اتفاق کی بات ہے، کہ طاہر بن محمد الاسفرائنی کی ایک اور کتاب کا تذکرہ کشف الظنون میں میری نظر سے گذرا، جو علم کلام اور اسلامی فرقوں سے متعلق ہے، اس سلسلہ میں میں نے یہ دیکھا، کہ حاجی خلیفہ نے مصنف کا سنہ وفات ۴۷۱ھ درج کیا ہے، اس سنہ کی بدولت ظاہر ہے کہ تفسیر کی اہمیت

میں نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے، میں نے اس مضمون میں یہ کوشش کی ہے کہ اس تفسیر کے متعلق ضروری معلومات مہیا کر دوں، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ فارسی تفسیروں میں اگر قدیم ترین تفسیر نہیں ہو تو کم از کم ان چند ابتدائی تفسیروں میں سے ہے، جن کو فارسی کی قدیم ترین تفاسیر کہا جاسکتا ہے،

قبل اس کے کہ اس فارسی تفسیر کے متعلق کچھ کہا جائے، یہ ضروری ہے کہ موجودہ اطلاعات کے ذخیرہ سے یہ اندازہ کیا جائے کہ فارسی زبان میں قرآن کی تفسیر کا خیال کب اور کیسے پیدا ہوا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے خاندان سامانی کی علم دوستی پر نظر جاتی ہے، صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق تفسیر طبری کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا، چنانچہ تفسیر طبری کے ذکر کے ذیل میں حاجی خلیفہ نے لکھا ہے،

"ونقلہ بعض المتاخرین الی الفارسیۃ لمنصور بن نوح السامانی"،

اس ترجمہ یا تلخیص کے کامل نسخے کسی کتب خانے میں نہیں پائے جاتے، البتہ اس کے اجزاء دو ایک مشہور کتب خانوں میں موجود ہیں، جن میں سے ایک کا حوالہ پیرس کی مشہور لائبریری (ببلوتھیک نیشنل) کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر بلوشے میں پایا جاتا ہے، اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ غالباً دنیائے اسلام میں قرآن کی تفسیر کو عربی سے فارسی میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش تھی ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ علمائے ماوراء النہر کے فتوے کے بعد منصور بن نوح سامانی نے اس کتاب کے ترجمہ یا تلخیص کا انتظام کرایا،

"واین کتاب تفسیر بزرگ است از روایت محمد بن جریر الطبری ترجمہ کردہ بزبان پارسی ودری راہ راست واین کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف بود این کتاب نبشتہ بزبان تازی وباسناد ہائے دراز بود وبیاوردند سوئے امیر سید مظفر ابوصالح منصور بن نوح ابن نصر بن احمد بن اسماعیل؟ وچنان خواست کہ مرین را ترجمہ کنند بزبان پارسی پس علمائے ماوراء النہر را گرد کرد واین از ایشان فتوی کرد کسی روا باشد کہ این کتاب را بزبان

پارسی گردانیم، گفتند روا باشد خواندن ونبشتن تفسیر قرآن بپارسی مرآن کسی راکہ او تازی نداند"

اس کا صحیح اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ تفسیر طبری کی تلخیص کے بعد سب سے پہلے فارسی میں کونسی تفسیر تصنیف ہوئی، پروفیسر براؤن نے فارسی کی ایک قدیم تفسیر پر ایک محققانہ مقالہ جولائی ۱۸۹۴ء کے ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں لکھا ہے اور غالباً اس پر متعدد مستشرقین نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی لیکن وہ اس فیصلہ پر نہ پہونچ سکے، کہ کیمبرج کی لائبریری کا وہ نسخہ جس کا انھوں نے اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے، حقیقت میں تفسیر کا قدیم ترین نسخہ ہے، یا نہیں کیمبرج کے مخطوطات کی فہرست میں بھی ڈ اس ناقص تفسیر کے مصنف اور اسکی تاریخ تصنیف کا صحیح پتہ نہ دے سکے، لیکن محاورات اور الفاظ کے متعلق ان کی سیر حاصل بحث سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قدیم تفسیر ہے، لیکن محض قیاس کی بنا پر اسکو ایک قدیم ترین تفسیر کہنا ذرا مشکل امر ہے،

زیر نظر تفسیر کو فارسی زبان کی اولین تصانیف میں شمار کرنا چنداں بعید از قیاس نہیں، اس لئے کہ اس کے مصنف کی تاریخ وفات حاجی خلیفہ کے بیان کے مطابق ۴۸۱ھ ہے، فلوگل کے نسخہ کشف الظنون میں اس مقام پر غلطی سے ۴۷۱ھ درج ہے اور یہی بعض یورپین فہرست نگاروں کا ماخذ ہے، ۴۷۱ھ کا اندراج محض کتابت کی غلطی کی بنا پر ہوا ہے، فلوگل نے اپنے نوٹس میں اس امر کو واضح کر دیا ہے، اور ۴۸۱ھ کی تاریخ کو ترجیح دی ہے، کشف الظنون میں جہاں اس تفسیر کا پورا نام درج ہے، وہاں تو تاریخ وفات مصنف ۴۷۱ھ ہے، جیسا کہ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے،

تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم للامام شاهفور والشیخ
الامام ابی المظفر طاهر بن محمد الاسفرائنی الشافعی المتوفی ۴۷۱ھ

البتہ کشف الظنون مطبوعہ استنبول میں اس جگہ بھی صحیح تاریخ وفات ۴۸۱ھ درج ہے ایک اور جگہ تفسیر الاسفرائنی کے ذیل میں لکھا ہے، :-

"تفسیر الاسفرائنی هو الامام ابو المظفر شهفور بن الطاهر الشافعی
المتوفی ۴۷۱ھ"

جہاں کتب متعلقہ ملل ونحل کا تذکرہ کیا ہے، وہاں ذیل کی عبارت ہے :-

"صنف منه جماعة منهم ابو منصور عبد القاهر بن طاهر البغدادی
المتوفی ۴۲۹ھ وابو المظفر طاهر بن محمد الاسفرائنی المتوفی ۴۷۱ھ الخ

اور ان کی کتاب التبصیر فی الدین وتمیز الفرقة الناجیة عن فرق الهالکین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"للشیخ امام ابو المظفر طاهر بن محمد الاسفرائنی ویقال له شهفور
بن طاهر الشافعی المتوفی ۴۷۱ھ وهو مجلد صغیر مشتمل علی خمسة عشر بابا الخ

طاہر بن محمد اسفرائنی کی اس کتاب کے دو نسخے پائے جاتے ہیں، ایک تو پیرس کی لائبریری میں موجود ہے، اور ایک برلین کے کتب خانے میں، برلین کی فہرست میں اسکو کتاب الفرق بین الفرق کے نام سے درج کیا گیا ہے، مندرجہ بالا مختلف عبارتوں سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ طاہر بن محمد اسفرائنی اور شہفور بن طاہر سے حقیقت میں ایک ہی مصنف مراد ہے اور ایک سے زیادہ جگہ ۴۷۱ھ کا اندراج تاریخ وفات کی حیثیت سے زیادہ قرین صحت ہے،

علامہ سبکی نے طبقات الشافعیہ میں شہفور بن طاہر بن محمد الاسفرائنی کا مختصر تذکرہ کیا ہے :- وہ لکھتے ہیں :-

"الاسفرائنی ابو المظفر الامام الاصولی الفقیه المفسر، ابیطه نظام الملک
بطوس قال عبد الغافر وصنف التفسیر الکبیر المشهور وصنف فی الاصول
وسافر فی طلب العلم قال وسمعت من اصحاب الاصم قال وکان له

اتصال مصاهرة بالاستاذ ابی منصور البغدادی توفی سنه احدی وسبعین واربع مایة"

ظاہر ہے کہ اس عبارت نے مصنف کے عہد کے متعلق جو شبہ باقی رہتا تھا، اس کو زائل کر دیا لیکن کتاب کے مطالعہ سے اسکے علاوہ اور بھی ایسی تائیدی شہادت ملی جس سے اس تاریخ کی صحت کے امکان میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا،

اس تفسیر کا ایک مکمل نسخہ دو جلدوں میں جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے بوڈلین لائبریری میں موجود ہے اس کی پہلی جلد کوپن ہیگن کے کتب خانے میں بھی موجود ہے، اور دوسری جلد انڈیا آفس کے کتب خانے میں، انڈیا آفس کے فہرست نگار ڈاکٹر اسیتھے نے اوس کو تفسیر طاہری کے نام سے موسوم کیا ہے، (تفسیر طاہری نمبر ۲۶۹۶) اور مصنف کا صحیح نام لکھا ہے، لیکن انھوں نے مصنف کا عہد اور سنہ وفات تحقیق کرنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی ہے، اور مبہم طریقہ پر یہ ذکر کر دیا ہے، کہ کتاب کے مطالعہ سے مصنف کے زمانے کا پتہ نہیں چلتا، غالباً ان کو تفسیر طاہری کے نام سے مغالطہ ہوا ورنہ اس کے متعلق معلومات کشف الظنون ہی سے مل سکتے تھے، بہرحال ان تمام فہرستوں میں یا تو اس کتاب کے زمانہ تصنیف کے متعلق کوئی معلومات بہم نہیں کئے گئے، یا اگر کئے گئے ہیں، تو فلوگل والے نسخہ کے غلط اندراج تاریخ کی بنا پر اسکو عہد متاخرین کی تصنیفوں میں سے شمار کیا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے، کہ قرائن و شواہد کی بنا پر یہ کتاب پانچوین صدی ہجری کے غالباً نصف اول میں تصنیف ہوئی ہے، میرے اس خیال کی تائید دو وجوہ سے ہوتی ہے، ایک تو مصنف نے مقدمہ تفسیر میں ایک فصل لکھی ہے جس میں قرآن کے فارسی ترجمہ اور تفسیر کی اہمیت کو اس پیرایہ میں ظاہر کیا ہے، کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے طرز میں بالکل نئی ہے، کم از کم اس قدر ضرور ماننا پڑیگا، کہ اسوقت تک فارسی تفسیر کا رواج نہیں ہوا تھا، اسلئے مصنف نے متعدد

دلائل سے اسکی اہمیت اور مفید ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ مطالعہ تفسیر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں، کہ مصنف نے کسی مقام پر چوتھی صدی ہجری کے بعد کے کسی عالم یا مفسر کا حوالہ اپنی کتاب میں نہیں دیا ہے صرف دو ایک جگہ امام ابو اسحٰق الاسفرائنی اور امام منصور بغدادی شاگرد امام ابو اسحٰق اسفرائنی کا اور دو ایک جگہ امام ابو بکر محمد بن الحسن النیسابوری الشہیر بابن فورک المتوفی ۴۰۶ھ کا ذکر کیا ہے امام اسفرائنی کو ایک جگہ اس نے اپنا استاد بتایا ہے، اور ان سے روایت کے سماع کا ذکر کیا ہے، امام ابو اسحٰق اسفرائنی کا سنہ وفات ۴۲۵ھ ہے، اس سے یہ امر بالکل یقینی ہو جاتا ہے کہ مصنف کی صحیح تاریخ وفات ۴۷۱ھ ہے، خود مصنف کی ایک عبارت جو جلد دوم میں تفسیر ثم رددناہ اسفل سافلین کے تحت میں مرقوم ہے، اسکی مؤید ہے، وہ یہ ہے،

"....چنانکہ در خبر آمدہ است از پیغمبر علیہ السلام گفت لاخرف علی العلماء، و این خبر از امام مسلمانان ابو اسحٰق الاسفرائنی شنیدم و نیز از وے شنیدم کہ گفت از پس نود سال کہ عمر وے گذشتہ کل شیئی منی فی النقصان الا العلم فانہ فی الزیادة"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے، کہ یہ قیاس کہ یہ تفسیر فارسی کی قدیم ترین تفسیروں میں سے ہے، بعید از صحت نہیں، یہ تفسیر بڑی تقطیع کی دو جلدوں میں ہے، ہر صفحہ میں ۲۲ سطرین ہیں، دونوں جلدوں کے صفحات کی تعداد ۴۱۲ ہے، اور اس کا کاتب حبیب اللہ بن جمال الدین اصفہانی ہے، جس نے اسکو ۹۴۲ھ میں شہر بغداد میں لکھا ہے، تفسیر عام عربی تفاسیر کی طرز پر ہے، اکثر حوالہ جات صحابہ اور تابعین اور قرون اولیٰ کے مفسرین کے ہیں،

تمہید کے بعد فصل اول میں ترجمۂ قرآن کی فضیلت اور اہمیت پر ایک مضمون ہے جس سے اس زمانے کے علماء کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

فصل اول اندر فضیلت ترجمہ کردن قرآن بہر لغتے کہ بدان حاجت افتد آنست کہ بدانی کہ خدائے

عزوجل قرآن فرو فرستاد تا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدان بترساند، و بیاگاہاند عرب را و نیز دیگر خلقان را
کہ قرآن بدیشان رسد، چنانکہ خدائے عزوجل گفت، واوحی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن
بلغ الخ بگو اے محمد کہ وحی فرستادند بر من این قرآن تا بترسانم شما را بدان و آن کسی را کہ بوے
رسد، و دیگر فرمود وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا، وما ارسلناک
الا رحمۃ للعالمین، و اندر تقریر این معنی گفت مصطفٰے بعثت الی الاحمر والاسود
و نیز فرمود بعثت الی الثقلین... و ترسانیدن عجم و آگاہ کردن ایشان را بفارسی، شاید کرد
ناچار بود، قرآن را ترجمہ باشد، بزبان دیگر، تا اہل لغت آن را بدانند، و ترتیب ایشان بدان
حاصل شود، و از بہر این معنی بود، کہ سلمان فارسی از مصطفٰے دستورے خواست تا قرآن بپارسی
بقوم خویش نویسد و یرا دستورے داد، چنین گفتند کہ وے قرآن نوشت و پارسی آن بنوشت، آن
کہ بآخران بنوشت ھذا القرآن الذی انزل علی محمد و معلوم ہمہ خردمندان آنست کہ
عرب تازی شناسان از ہر گروہے، اندر عدد کمتر باشند، از کسانے کہ تازی نشناسند و واجب
آن ست کہ دین و شریعت و معنی وحی خدائے عزوجل بدیشان رسد، و ہرگز آن تمام نیابد الا بدان کہ
فرمانہائے خدائے تعالے ایشان را بنغتے کہ ایشان بدان راہ برند، ترجمہ کنی تا منفعت آن
اندو جہان بدیشان رسد کہ بیشترین خلق اند، و سواد اعظم اند و ہیچ حال نشاید، کہ ایشان را
محروم گردانید، و از بہر این بود کہ ائمہ و علمائے دیانت اندر ہر عصرے بر ایشان شفقت بردند
اعتقادہائے بفارسی کنند، و احکام عبادت بپارسی اثبات کردند تا ایشان بقرآن راہ یابند
و از بہر این معنی بود، کہ اول و آخر امت اجماع کردند بر آن کہ تفسیر قرآن بپارسی می گویند
اندر مجلسہائے علم و بر سر منبرہا اندر مجامع خاص و عام اہل دین و دنیا و ہیچ کسے روا نداشت
کہ بدان انکار کنند بلکہ ہمگنان آن را از فرض کفایت شمردند، تا اگر ہمہ خلق از دعوت خلق بدین

و نشر آن اندر میان مسلمانان اعراض کنند و ہر کسے بر شغل خویش اقبال کنند ہمہ اندر حرج باشند
و اندر برخے از احوال آن را واجب دانستند چنانکہ بسیارے از اہل سنت و جماعت گفتند اگر
کسے فاتحۃ الکتاب نداند و نتواند آموخت ترجمۂ آن را باید آموخت تا بدان نماز ہمی کند تا
آنگہ الحمد بیاموزد و گفتند کہ آن اولیٰ تر باشد از تسبیح کہ ترجمۂ آن نزدیک تر بدان از انچہ
ذکرے دیگر و اگر چنان بود، کہ مسلمانان گروہے از کافران را باسلام دعوت کنند و ایشان
گویند کہ قرآن بر ما عرضہ کنید، و تفسیر آن ما را پیدا کنید و اگر درست و راست باشد و کتاب ما را
موافق و مصدق باشد مسلمانی قبول کنیم واجب بود ترجمہ کردن قرآن و بدیشان فرستادن
چنانکہ یاد کردیم از حدیث سلمان و نیز اتفاق کردہ اند مسلمانان بدان کہ ہرچہ نشاید گفتن
نشاید نوشتن، مقرر شد کہ یاد کردیم فضیلت ترجمہ کردن و معلوم شد کہ اندر حالی فرض کفایت
است تا معظم خلق محروم نگرداند از منفعت کتاب خدائے عزوجل اندر حالی از جملہ فرض اعیان
است چنانکہ یاد کردیم و چیزے کہ آن را اندر دین مسلمانی این محل بود کہ آن را یاد کردیم
و انکار نکنند بدان مگر کسے کہ غافل بود از اصول شریعت و یا ملحدے کہ نخواہد دین ظاہر گردد،
و ہر کسے بدان راہ یابد تا وے از ان الحاد خویش متمکن باشد اہل دیانت راہ یابند، یریدون
ان یضیقوا الخ،

گروہے از علما غلو کردند و گفتند، ترجمہ قرآن قرآن باشد و این قول دور است از حقیقت
از بہر آن کہ نظم قرآن معجز است، و ترجمۂ قرآن معجز نباشد، و انچہ از جنس معجزات نباشد قرآن
نباشد و اگر ترجمۂ قرآن قرآن بودے بایستی با ترجمہ شعر نیز شعر بودے بہر عبارت کہ بودے
و چون محال بود آن اولیٰ تر کہ نباشد و بدان کہ انچہ درین باب نگاہ باید داشتن از احتیاط کردن
قرآن آنست کہ چیز اندر مصحف نوشتہ نباشد کہ نہ قرآن باشد مگر چنانکہ ممیز باشد از ان بلونے دیگر یا

به هیئتے تاکسے را اشتباه نیفتد و نه پندارد که آن قرآن است مجہول بود که ترجمه سور تنہا و عواشر
وعلامات سجدات و اسباع و اجزا را اندر مصحف بلونے دیگر اثبات کردند و اما اگر کسے تفسیرے نویسد
تازی یا پارسی و اما آن را بخطے ممیز نه گرداند روا باشد زیرا که ہر کسے داند که اندرین کتاب قرآن و
غیر قرآن جمع کرده اند است، وے را آن اشتباه که یاد کردیم نیفتد، پس اندر تفسیر که نویسند تازی
یا پارسی و قرآن را بخطے دیگر توفیقی نیکو بود دریافته باشد و احتیاطے تمام باشد که اندر توقیر کتاب خدائے
عزوجل بجائے آورده دیر ابدان ثواب نیکو امید میدارم۔"

تمہید میں حمد و نعت کے بعد مصنف نے اس تفسیر کی تصنیف کے وجوہ اور ضرورت سے بحث کی ہے
اور اس سلسلہ میں ان متعدد کوششوں کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے، جو قرآن کے فارسی ترجمے کے متعلق شاید
ہوتی رہی ہیں، ذیل میں اس حصہ کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے مصنف کی غرض و غایت پر روشنی پڑتی ہے

"حضرت عبداللہ بن عباس کے زمانے سے آجتک علمائے امت میں بہت سے افراد نے اس امر
کی کوشش کی ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق عربی میں قرآن کی تفسیر جمع کریں، ایک جماعت کو اس
امر کی ضرورت پیش آئی، کہ فارسی جاننے والوں کے لئے قرآن کے الفاظ کا اس طرح ترجمہ کیا جائے
کہ فارسی سے واقف لوگوں کے لئے قرآن پڑھنا اور سمجھنا سہل ہو جائے، گو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مجالس
علمیہ میں متفرق طور پر ترجمہ سننے کے موقعے انہیں ملجاتے ہیں، بعض لوگوں نے اپنے اپنے زمانے
میں قرآن مجید کے فارسی ترجمے کا بیڑا اٹھایا، لیکن جب علمائے نے بغور ان کا مطالعہ کیا تو اس میں بہت
کچھ غلطیاں دیکھیں، کہیں تو بعض مترجمین نے محض لغوی معنوں کو پیش نظر رکھا تھا، اور مفسرین
کی تشریحات کو نظرانداز کر دیا تھا، یا کہیں بعضوں نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ قرآن کے
ہر ایک لفظ کا فارسی کے ایک ہی لفظ میں ترجمہ کریں، اس سے معنوں میں نقص پیدا ہو گیا،
انھوں نے یہ نہ سمجھا کہ قرآن کے الفاظ جامع تر ہیں، اور یہ آسان نہیں کہ اس کے ہر ایک لفظ

کے معنی فارسی کے ایک ہی لفظ میں ادا ہو سکیں، پس جب ان ترجموں میں میں نے یہ خلل دیکھے
جنکا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، تو میں نے خدائے تعالیٰ سے اس امر کی توفیق چاہی، اور جہانتک
مجھے توفیق حاصل ہوئی میں نے اس امر کی پوری کوشش کی ہے کہ صحت الفاظ کے ساتھ فارسی میں
ایسا ترجمہ کروں، جو لغت عرب کے بھی موافق ہو، اور اقوال مفسرین کے بھی مطابق، اس امر کا
میں نے خاص لحاظ رکھا ہے کہ دین کے اصول کا اس میں لحاظ رہے، اور یہ ترجمہ مذاہب اہل ہوا
و بدعت کی تاویلوں سے پاک اور طریقۂ اہل سنت الجماعت کے مطابق ہو، یہی وجہ ہے کہ میں نے اسکا
نام تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم رکھا ہے۔"

مصنف نے اس کے مقدمے کو چار فصلوں میں تقسیم کیا ہے، پہلی فصل ترجمۂ قرآن کی فضیلت میں ہے جسکو
میں نے اوپر نقل کر دیا ہے، دوسری فصل اعتقاد اہل سنت الجماعت پر ہے، تیسری فصل میں اسمائے حسنیٰ کے معنی
و اوصاف خداوندی کے متعلق مختصر تشریحات ہیں، چوتھی فصل میں ان احادیث و آثار کا ترجمہ کیا گیا ہے جن سے
فضیلت قرآن ثابت ہوتی ہے، اسکے بعد تفسیر کی ابتدا ہوتی ہے، اس میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ آیات قرآنی کیساتھ
ہی بین السطور فارسی کے الفاظ اور جملے لکھ دیئے ہیں کہیں کہیں ترجمہ کی ہیئت تحت اللفظ ترجمہ کی سی ہے اور کہیں بالکل
تفسیری ترجمہ اور کہیں لکل عربی لفظ کے مقابل فارسی لفظ رکھ دیا گیا ہے، اسکے بعد احادیث و آثار اور صحابہ و تابعین کے اقوال
سے آیات کی تفسیر کیگئی ہے، علامہ سبکی کے بیان کے مطابق مصنف متکلمین کے طبقہ سے ہیں اسلئے اس کا اثر بھی کہیں کہیں تفسیر
میں نظر آتا ہے، مثلاً "وان ہذا صراطی مستقیما" کی تفسیر میں انھوں نے مختلف فرقہ ہائے اسلام و فلاسفہ کے
متعلق ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے، اور جابجا اس میں اشاعرہ کے خیالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے،

یہ تفسیر مضامین کے لحاظ سے تو شاید دوسری عربی تفسیروں سے چنداں مختلف نہیں ہے
لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ بہت ممکن ہے تلخیص تفسیر طبری کے بعد یہی سب سے
پہلی تفسیر ہو، جو زبان فارسی میں لکھی گئی،

صوفیانہ نظام اخلاق

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۲)

مہمان نوازی کے علاوہ ہمارے صوفیہ نے دوسرے اجتماعی اخلاق کی بھی نہایت عمدہ مثالیں قائم کی ہیں، اخلاقی حیثیت سے سب سے بڑی اجتماعی خدمت یہ ہے، کہ اپنی قوم اور اپنی جماعت کا اثر و اقتدار قائم کیا جائے، اور اسکو ملک میں مقبولِ عام بنایا جائے، اور صوفیہ میں بعض بزرگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے صوفیہ کے حسنِ قبول کے لئے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صرف کر دیا ہے، مولانا جامی ابراہیم بن داؤد قصار کے حال میں لکھتے ہین،

"از اقران جنید و ابو عبد اللہ الجلاء در سنہ ست و عشرین و ثلثمائۃ (۳۲۶ھ) برفتہ از دنیا،

شیخ الاسلام گفت کہ وے سی سال یک سفر کردہ بود تا دل خلق را بر صوفیان بہ قبول آرد و رامت کند و ازاں بے ادبیہا کہ بے ادبا کردہ بودند، وے آن ہمہ را بصلاح آورد، بنگر چہ جوانمردی داشتہ"[۱]

اجتماعی اخلاق کا سب سے بڑا مظہر خلق کی حاجت روائی ہے، اور صوفیہ میں مومل جصاص نے اس کے لئے اپنی ذات کو وقف کر رکھا تھا، ایک صوفی کا بیان ہے، کہ ایک بار جب وہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلے، تو مین ان کے پیچھے پیچھے اُن کے گھر تک گیا، جب دروازے پر پہونچا تو وہان تقریباً تین سو اہل حاجت

کا مجمع تھا، اونھون نے سب کی حاجتوں کو سنا، اور اپنے رفقار کو ان کے پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر روانہ کیا، اور ایک گھنٹے مین اس کام سے فارغ ہو گئے،[۲]

یہ اجتماعی خلق اخیر زمانہ تک صوفیہ میں موجود رہا، مولوی غلام علی آزاد میر سید فیروز کے حال میں لکھتے ہیں،،

"در شیوۂ بذل و سخا و انجاح مطالب مستمندان یگانہ می زیست شبانہ روز اطعمہ و اغذیہ برائے وارد و صادر در مطبخ مہیا می داشت و چہار صد دختر غربا و ضعفا رکہ استطاعت تزویج نداشتند فراخور مرتبۂ ہر کدام از طرف خود نقد و جنس سامان کردہ کدخدا ساخت"[۳]

ایک بار چند لوگ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہر ایک نے کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کیا، ان میں ایک طالب العلم بھی تھا، اوس نے تھوڑی سی خاک کاغذ کے پرزے میں لپیٹ کر پیش کی، خادم نے یہ تمام تحائف اٹھائے، تو حضرت نظام الدین اولیاؒ نے کہا کہ اسکو یہیں رہنے دو، یہ سرمہ خاص ہماری آنکھون کے لئے ہے، اب طالب العلم نے اس بدتمیزی سے توبہ کی حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اس کا حال دریافت کیا، اور فرمایا، کہ

"اگر ادرارے یا نانے ترا حاجت باشد، مارا بگوے"[۴]

شاہ احمد شرعی کو دعاؤں کے علم و عمل میں کمال حاصل تھا، اور وہ ہر جمعہ کو اس علم کی قوت سے بادشاہ کو اپنے پاس کھینچ بلاتے تھے، اور اس کے ذریعہ سے مسلمانون کی حاجتیں پوری کرواتے تھے،[۵]

دیانت ایک اجتماعی خلق ہے، اور ہمارے صوفیہ نے دیانت کی اعلیٰ سے اعلیٰ مثالین قائم کی ہیں، ہشام بن عبدان کا شمار کبار صوفیہ میں تھا، اونھون نے دودھ کھانے کے لئے ایک بکری پال

[۱] نفحات الانس تذکرۂ ابراہیم بن داؤد۔

[۲] نفحات الانس تذکرہ مومل جصاص [۳] مآثر الکرام جلد اول ص ۴۶، [۴] اخبار الاخیار ص ۵۵، [۵] اخبار الاخیار ص ۲۰۷،

رکھی تھی، اور اسکی بڑی نگہداشت کرتے تھے، اور اسکو خود میدان میں چرانے کے لئے لیجاتے تھے، ایک روز اتفاق سے وہ سو گئے، جب جاگے تو دیکھا کہ بکری ایک شخص کے کھیت میں چر رہی ہے، اسکو پکڑ کر کھیت والے کے پاس لے گئے، اور اسکو حوالے کرنے لگے، اوس نے کہا کہ میں نے درگذر کیا، بولے، اب مجھے اس کی ضرورت نہیں، اُس نے ہر چند اصرار کیا نہ مانے، اور بکری کو اس کے پاس چھوڑ کر چلے آئے،

شیخ ابو عبد اللہ خفیف کہتے ہیں، کہ میں انکے ساتھ ایک دعوت میں شریک ہوا، میزبان نے ان کے سامنے حلوے کی ایک طشتری پیش کی، میں نے کہا کہ میرا حصہ بھی عنایت فرمائیے، بولے میزبان نے مجھے تمھارے دینے کی اجازت نہیں دی ہے، میں نے بہت کہا، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے[1]

حضرت بشر حافی کے تین بہنیں تھیں، اور سب کی سب صوفیانہ زندگی بسر کرتی تھیں، ان میں ایک بہن چرخہ کاتتی تھیں، ایک بار وہ امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور کہا کہ میں رات کو چراغ کی روشنی میں چرخہ کاتتی ہوں، لیکن جب کبھی چراغ بجھ جاتا ہے، تو چاندنی کی روشنی میں کاتنے لگتی ہوں، تو کیا ان دونوں حالتوں کے کاتنے میں فرق وامتیاز کروں؟ بولے اگر تمکو فرق معلوم ہوتا ہو تو ضرور فرق کرو،

ان کی دوسری بہن کا بھی یہی مشغلہ تھا، ایک روز انھوں نے بھی امام موصوف سے سوال کیا کہ میری کل پونجی دو دانگ ہے، جن سے میں روئی خرید کر کاتتی ہوں، اور اسکو نصف درہم پر فروخت کرتی ہوں جس سے ایک ہفتے تک میری معاش چلتی ہے، لیکن ایک رات ایک سائل مشعل لیکر گذرا، اور میں نے اسکی روشنی میں سوت کاتا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ خدا کی جانب سے اس کا مجھ سے مطالبہ کیا جائے گا جس سے آپ مجھے سبکدوش فرمائیے،[2]

[1] نفحات الانس تذکرہ ہشام بن عبدان، [2] ابن خلکان جلد اول ص ۹۰ تذکرہ بشر حافی،

ابو عبد اللہ محمد بن عطار، روذباری ایک صوفی تھے، ایک روز کسی نے ان کی اور انکے رفقاء کی دعوت کی، وہ چلے تو راہ میں ایک شخص نے کہا کہ یہ صوفیہ لوگوں کے مال و دولت کو لوٹ لیتے ہیں، یہ کہکر اُن کو گالیاں دیں، اور کہا کہ ایک صوفی نے مجھ سے سو درہم قرض لئے، اور واپس نہیں کیا، اب میں اس کی جستجو کہاں کروں؟ یہ سنکر ابو عبد اللہ محمد بن عطار روذباری نے دعوت دینے والے سے جوان کا اور فرقہ صوفیہ کا معتقد تھا، کہا کہ مجھے سو درہم دو، اس نے درہم پیش کئے، تو اپنے ایک رفیق کو اس شخص کے پاس بھیجا کہ یہ وہ رقم ہے، جس کو ہمارے ایک رفیق نے تم سے لی تھی، اب اس کا پتہ چل گیا ہے،[1]

اجتماعی اخلاق کے سلسلے میں صوفیہ کا سب سے بڑا اخلاقی کارنامہ بذل و ایثار ہے،

ایک بار ابو حامد دوستان مروزی ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے، ایک سقہ نے ان کو پانی دیا، لیکن وہ کچھ دیر تک پانی کو ہاتھ میں لئے رہے، سقہ نے کہا کہ آپ پانی کیوں نہیں پیتے؟ بولے ایک مکھی پانی پی رہی ہے، اسلئے میں ٹھہر گیا ہوں کہ وہ پانی پی لے،[2]

شیخ انور بکریوں کو کھلا پلا کر خوب فربہ کرتے، اس کے بعد انکو ذبح کر کے انکا گوشت فقراء کو کھلاتے اور خود نہ کھاتے،[3]

اجتماعی اخلاق کی سب سے زیادہ جامع تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پاکیزہ الفاظ میں دی ہے:-

المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ،	کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور جسکی زبان سے مسلمانوں کو کوئی صدمہ نہ پہونچے،

ابو بکر وراق اس پر اس شدت سے عمل کرتے تھے، کہ اپنے جسم سے مکھی تک کو بھی اس خوف

[1] ابن حوقل ص ۲۲ [2] نفحات الانس تذکرہ ابو حامد دوستان، [3] اخبار الاخیار ص ۱۵۵،

ے نہیں اوڑاتے تھے، کہ وہ اڑ کر کسی دوسرے مسلمان کے جسم پر بیٹھ جائے گی[۱]،

اجتماعی حیثیت سے ایک مسلمان کا سب سے بڑا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو مسلمانوں کے بغض، عداوت اور رشک وحسد سے پاک وصاف رکھے، اسی اخلاقی نکتے کو رسول اللہ صلعم نے ان پاکیزہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے،

لایبلغنی احد من اصحابی عن احد	میرے اصحاب میں سے کوئی شخص کسی
شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم	کی غیبت یا شکایت مجھ تک نہ پہونچائے کیونکہ
انا سلیم الصدر،	مجھے یہ پسند ہے کہ میں تمھاری صحبت میں تشریف
(ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث)	ہوں تو میرا سینہ پاک وصاف ہو،

ہمارے صوفیہ نے بھی اس اخلاقی وصف کی اہمیت کو سمجھا ہے، چنانچہ محفوظ بن محمد کا قول ہے،

اکثر الناس خیراً اسلمھم للمسلمین	سب سے زیادہ نیکی اس شخص میں پائی جاتی
صدرا،[۲]	ہے جس کا سینہ مسلمانوں کے بغض وحسد سے
	بالکل پاک وصاف ہو،

شرفا، کو تعلیم وتربیت دینا اور اُن کی زندگی کو بہتر بنانا بہت بڑی اخلاقی اور اجتماعی خدمت ہے، اور بعض صوفیہ نے یہ خدمت انجام دی ہے،

نارنول سے تین کوس کے فاصلے پر ایک قصبہ دہرسو ہے، وہان چند سادات رہتے تھے جو نہایت غیر شریفانہ زندگی بسر کرتے تھے، شیخ حمزہ دہرسو نے محض اُنکی تعلیم وتربیت کیلئے دہرسو میں قیام کیا، اور اس غرض سے اُن کے لئے ایک فارسی دان اور دوسرا عربی دان مدرس مقرر کیا، اون کے لئے فتوحات کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور اس طریقہ سے جو کچھ ملتا تھا، اوسکو طلبہ وفقرا

۱؎ نفحات الانس تذکرہ ابو المظفر ترمذی ۲؎ نفحات الانس تذکرہ محفوظ بن محمد،

صرف کرتے تھے، اخبار الاخیار میں ہے،

"طالب العلمان وفقرا، را مواسات میکرد ابواب فتوح بروے بسیار مفتوح بود و احلا انقطاع نداشت ہمہ را صرف فقراء کروے وچیزے نہ نگاہ داشتے، اولاد و ازواج خود را نیز انچہ قسمت می آمد امیداد وزیادہ ازان روا نداشتے[۱]،"

ہمارے صوفیہ کی سب سے بڑی اخلاقی فضیلت یہ ہے کہ وہ عیسائی راہبوں کی طرح بالکل دنیا سے الگ تھلگ نہیں ہو گئے تھے، بلکہ خدا کے ساتھ دنیا دارون سے بھی رسم وراہ اور لطف و[illegible]ت رکھتے تھے، چنانچہ ابو عبد اللہ سالمی سے لوگون نے پوچھا کہ اولیاء اللہ کی شناخت کیا ہے؟ [illegible]ے لطافت زبان، حسن اخلاق، تازہ روئی، کشادہ دلی، اور اعتراض کم کرنا اور عذر خواہون کے عذر قبول کرنا، اور مخلوق پر چاہے وہ نیک ہون یا بد پوری شفقت کرنا[۲]،

ایک صوفی کا قول ہے کہ فقر کے آداب میں ایک یہ ہے، کہ فقیر گرفتاران محبت دنیا کو ملامت وسرزنش نہ کرے، بلکہ اُن کے ساتھ لطف ومحبت سے پیش آئے، اور ان کے لئے دعاے خیر کرے تاکہ خداوند تعالی ان کو اخلاص عطا فرمائے[۳]،

ابوبکر وراق کی چادر کے ایک کنارے پر حرف خ اور دوسرے کنارے پر حرف "م" لکھا ہوا تھا، ایک شخص نے اس کے متعلق سوال کیا تو بولے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب حرف خ کو دیکھون تو مجھے اخلاص، اور جب حرف م کو دیکھون تو مروت یاد آئے، کیونکہ خلق کے ساتھ بہ مروت پیش [illegible]نے سے انسان ان پر بار نہیں ہوتا[۴]،

عبد اللہ بن عصام مقدسی کا قول ہے کہ

۱؎ اخبار الاخیار ص ۱۷۵، ۲؎ نفحات الانس تذکرہ ابو عبد اللہ السالمی ۳؎ نفحات تذکرہ محمد واحمد ابنا ابی الورد ۴؎ نفحات تذکرہ ہاشمی سغدی،

"باید کہ بظاہر با خلق باشی و بر ایشان بہ بخشائے و حقوق ایشاں را ضائع نگردانی"[1]

ہمارے صوفیہ عیسائی راہبوں کی طرح بالکل زاہد خشک بھی نہیں ہو گئے تھے، چنانچہ ابو الحسن ابن سمعون عمدہ لباس پہنتے تھے، اور بہترین غذائیں کھاتے تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اور لوگوں کو تو زہد اور ترکِ دنیا کی دعوت دیتے ہیں، اور خود آپ کی خوراک اور پوشاک کی یہ حالت ہے؟ بولے کہ خدا کے ساتھ جب تعلقات استوار ہو گئے، تو پھر،

"نرمیٔ جامہ و خوشیٔ طعام زیاں ندارد"[2]

شیخ ابو زرعہ رازی اکثر مذاق کیا کرتے تھے، لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، تو بولے کہ میرے پاس اس کے سوا اور کیا ہے، کہ فقیروں کو اپنی باتوں سے ہنسا دوں[3]،

ایک بار شیخ نجم الدین رازی کی ملاقات شیخ صدر الدین قونوی اور مولانا جلال الدین رومی سے ہوئی، مغرب کی نماز کا وقت آیا تو شیخ نجم الدین رازی نے نماز پڑھائی، اور دونوں رکعتوں میں سورۂ قل یا ایھا الکافرون پڑھی، نماز ختم ہوئی تو مولانا جلال رومی نے مذاقاً شیخ صدر الدین سے کہا، کہ غالباً ایک بار یہ سورہ آپ کے لئے اور ایک بار میرے لئے پڑھی[4]،

ہمارے صوفیہ نے اگرچہ گوشہ گیری اختیار کر لی تھی، تاہم وہ اپنے گوشۂ خلوت سے نکل کر میدانِ جہاد میں بھی اپنی عملی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے، خواجہ محمد بن ابی احمد چشتی لوگوں کو ہمیشہ ترکِ دنیا کی ترغیب دیا کرتے تھے، لیکن جب سلطان محمود نے غزوۂ سومنات کا ارادہ کیا، تو خواجہ کو بھی غیب سے شرکت کا اشارہ ہوا، اور وہ ستر سال کی عمر میں چند درویشوں کے ساتھ شریکِ جہاد ہوئے اور بالآخر لشکرِ اسلام کو فتح نصیب ہوئی[5]،

[1] نفحات تذکرہ عبد اللہ بن حسام المقدسی، [2] نفحات تذکرہ ابو الحسین بن سمعون، [3] نفحات تذکرہ شیخ ابو زرعہ رازی [4] نفحات تذکرہ شیخ نجم الدین رازی، [5] نفحات تذکرہ خواجہ محمد بن ابی احمد چشتی،

فتنۂ تاتار میں جب تاتاری خوارزم میں پہونچے، تو شیخ نجم الدین کبری نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور اُن میں سے بعض سے کہا کہ اپنے شہر میں جاؤ کہ یہ آگ جو مشرق سے بھڑکی ہے، مغرب تک کو خاک سیاہ کر دے گی، ایسا فتنہ اس امت میں کبھی نہیں اٹھا تھا، بعض اصحاب نے کہا کہ دعا فرمائیے کہ یہ بلا مسلمانوں کے شہر سے دور رہو، فرمایا کہ دعا سے یہ مصیبت نہیں ٹلے گی، بالآخر اپنے اصحاب کو شرکتِ جہاد پر آمادہ کیا، اور خود نہایت پامردی سے لڑکر شہید ہوئے[1]،

غرض اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے، کہ ہمارے صوفیہ نے کبھی انفرادی اخلاق کے ساتھ ایجابی اور اجتماعی اخلاق کا سررشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا تھا، البتہ تصوف ہی کے اثر سے قلندریہ اور ملامتیہ کے دو فرقے پیدا ہو گئے تھے، جن کا نظام اخلاق شریعت اور عرفِ عام دونوں کے مخالف تھا، ان میں فرقۂ قلندریہ کا اخلاقی اصول خدا کے ساتھ ہمیشہ دل کو خوش رکھنا تھا، اور اس خوش طبعی کے سوا وہ اور کسی چیز کے خواستگار نہ تھے، اسلئے عام معاشرتی اور اجتماعی آداب کے پابند نہ تھے، فرائض کے سوا اور کسی قسم کی عبادت نہیں کرتے تھے، ہر قسم کی مباح چیزوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، اگرچہ یہ لوگ زاہد و عابد نہ تھے تاہم نہایت قناعت پسند تھے، اور دنیوی مال و متاع کو جمع نہیں کرتے تھے،

اس کے بخلاف ملامتیہ فرقہ عبادات کا سخت پابند تھا، اور نیکی کے تمام کام انجام دیتا تھا اور اسکو بڑی فضیلت خیال کرتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ ان تمام اعمال کو چھپاتا تھا، اور اس غرض سے وضع و لباس میں نہایت عامیانہ زندگی بسر کرتا تھا، تاکہ اوسکی باطنی کیفیت ظاہر نہ ہونے پائے[2]،

یہ فرقہ بالکل ریاکاروں اور منافقوں کے مقابل میں قائم ہوا تھا، کیونکہ اربابِ سلوک میں ایک گروہ ایسا بھی تھا، جو ہر ممکن طریقہ سے اپنی عزت و جاہ کو بڑھاتا تھا، اسلئے فرقۂ ملامتیہ نے بالکل اس کے

[1] نفحات تذکرہ شیخ نجم الدین کبری، [2] مقریزی جلد ۴ ص ۳۰۱

مخالف روش اختیار کی، اور اپنے عمدہ اعمال کے اخفا کے لئے برے اعمال کو ظاہر کیا، یعنی جو اعمال خدا
کے نزدیک قابلِ ستایش تھے، ان کو چھپایا، اور جو اعمال مخلوق کے نزدیک ناپسندیدہ تھے، اُن کا
اظہار کیا، یہ لوگ قرآن مجید کی اس آیت سے

وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ — وہ لوگ ملامت کرنے والے کی ملامت کا
خوف نہیں کرتے،

اپنے اس طرزِ عمل پر استدلال کرتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کا بھی یہ قول تھا، کہ تم میں کوئی اگر روزہ رکھے، تو اپنی
داڑھی اور ہونٹھ میں تیل لگائے، تاکہ لوگ اسکو دیکھکر کہیں کہ یہ روزے سے نہیں؛
علامہ ابن قیم اس فرقے کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ روش بعض حالتوں میں مستحسن، اور بعض حالتوں
میں مذموم ہے، اگر اپنی حالت کے چھپانے کے لئے کوئی شخص ایسی چیز کا اظہار کرے، جس کا ظاہر کرنا
جائز اور خدا اور اس کے رسول کے نزدیک قابلِ مواخذہ نہ ہو، تو یہ روش پسندیدہ ہے، مثلاً اگر ایک شخص
نے فقر و فاقہ کے چھپانے کیلئے دولت مندی کا یا مرض کے چھپانے کیلئے صحت کا اظہار کیا تو یہ نہایت عمدہ بات ہے
اور دل پر اسکا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے، لیکن اگر کسی نے اخفاءِ حال کے لئے ناجائز باتوں کا اظہار کیا، جیسا کہ ایک
شخص کی نسبت منقول ہے کہ وہ حمام میں گیا اور ایک شخص کا کپڑا چرا کر آہستہ آہستہ چل کھڑا ہوا یہانتک کہ لوگوں
نے اس کو پکڑا، اور برا بھلا کہا تو یہ حرام ہے، اور ایسا کرنا جائز نہیں، خود حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان
کو اپنی ذات کو ذلیل کرنا نہیں چاہئے"[۱]

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ صوفیانہ نظامِ اخلاق پر بغیر نقد و بحث کے عمل کرنا مناسب نہیں، اسکا
جو حصہ شریعت اور عرف عام سے مطابقت رکھتا ہے، وہ بے شبہہ قابلِ تقلید و اتباع ہے لیکن اسکے علاوہ جو
سلبی اور انفرادی اخلاق ہیں، یا فرقہ قلندریہ و ملامتیہ نے جو روش اختیار کی ہے، وہ قابلِ بحث و نظر ہے،

[۱] مدارج السالکین جلد ۲ ص ۱۱۱-۱۱۲

عربی شفاخانے

از

جناب مولوی محمد یوسف صاحب کوکن رفیق دار المصنفین

(۲)

شفاخانہ نوریہ یہ شفاخانہ بازارِ حمیدیہ کے پورب میں قلعہ سے تقریباً پانچسو میٹر کی دوری پر ہے، اس کو
سلطان عادل نور الدین محمود ابو الثناء بن زنگی آق سنقر نے ۵۴۹ھ مطابق ۱۱۵۴ء میں بنایا تھا، تمام
عربی شفاخانوں میں یہ شفاخانہ بہت مشہور ہے، اور اب تک اس کی عمارت کھڑی ہے،
نور الدین زنگی دولتِ نوریہ کے سلسلہ کا دوسرا تاجدار ہے، وہ نسلاً کرد تھا، اور عجم اور عراق
و جزیرہ کا حکمراں تھا، اور جب ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں اس کا باپ عماد الدین مارا گیا، تو شام کی حکومت بھی اس کو
مل گئی، اور آگے چل کر اسکی حکومت کا دائرہ مصر تک پھیل گیا تھا، ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء میں وفات
پائی تھی، تاریخ کی کتابوں میں نور الدین کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں، اتنی شاید ہی دنیا کے کسی بادشاہ
کی کی گئی ہوں، ابن اثیر نور الدین کے متعلق لکھتا ہے:-

اس کے حسن سیرت اور عدل و انصاف کی وجہ سے ساری زمین اس کی تعریفوں سے
بھر گئی، میں نے پرانے بادشاہوں کی سیرت کا مطالعہ کیا، مگر خلفاء راشدین اور عمر بن
عبد العزیز کے بعد اس سے زیادہ اچھی سیرت اور انصاف والا کسی کو نہیں پایا، وہ اپنے
زہد و عبادت اور علم کی وجہ سے اپنے زمانہ ہی میں مشہور ہو چکا تھا، وہ اپنے کھانے پینے،

پہننے اوڑھنے وغیرہ کے تمام اخراجات اُس کی جاگیر کی آمدنی سے، جو اس نے اپنے حصۂ غنیمت سے خریدی تھی، پورے کرتا تھا،....... ایک مرتبہ اس کی بیوی نے تنگدستی کی شکایت کی تو اس نے حمص کی تین دوکانیں اسکو دیدیں، جس کا سالانہ کرایہ بیس دینار تھا، جب بیوی نے دوبارہ کہا کہ یہ رقم کافی نہیں ہے، تو اس نے جواب دیا کہ میرے پاس اسکے سوا کچھ نہیں ہے، میرے پاس جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کی ملکیت ہے، اسمیں کسی قسم کی خیانت نہیں کر سکتا، اور تیرے لئے میں جہنم کی آگ میں داخل نہیں ہو سکتا"۔(۲)

شفاخانہ نوریہ کے بنانے کی ضرورت اس طرح پیش آئی، کہ دوسری صلیبی لڑائی میں یورپ کا کوئی بڑا بادشاہ گرفتار ہو کر آیا، اس بادشاہ نے بہت سا زر فدیہ دے کر اپنے کو چھڑانا چاہا، نور الدین نے اپنے افسروں سے اس بارے میں مشورہ کیا، سب نے رائے دی کہ اسکو رہا نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے، مگر نور الدین کا دل اس رائے کے خلاف تھا، چنانچہ اس نے استخارہ کیا، اور زر فدیہ لیکر ایک رات کو اسے آزاد کر دیا، لیکن وہ اپنے گھر پہونچنے سے پہلے ہی مرگیا، جب نور الدین کو اس کے مرنے کی خبر ہوئی، تو اس نے فدیہ کی رقم سے شفاخانہ نوریہ قائم کر دیا،(۳)

شفاخانہ نوریہ کی تعمیر کا نگران امیر کمال الدین شہرزوری جو سلاطین نوریہ کے دربار میں بہت ہی رسوخ رکھتا تھا، مقرر کیا گیا، اس شفاخانے کے اکثر دروازے موید الدین ابو الفضل بن عبد الکریم مہندس کے بنائے ہوئے ہیں، جو علم ہندسہ، نجاری اور طب میں پوری مہارت رکھتا تھا،(۴۳) ممکن ہے اس کے بنائے ہوئے دروازوں میں سے کچھ اب تک باقی ہوں،

ایک سے زیادہ مرتبہ شفاخانہ نوریہ کی عمارت اور جائے وقوع میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا، مگر اس ترمیم و اضافہ سے اسکی اصلی شکل و صورت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی،

سب سے پہلی ترمیم ۶۳۵ھ مطابق ۱۲۳۷ء میں ملک جواد مظفر الدین یونس بن شمس الدین ممدود بن الملک العادل کے زمانہ میں ہوئی، اس نے بدر الدین المظفر بن القاضی مجد الدین کو ایک فرمان کے ذریعہ شفاخانہ نوریہ کا افسر الاطباء مقرر کیا،

بدر الدین نے بہت سے مکانات جو شفاخانہ کے پہلو میں تھے، خرید کر شفاخانہ میں شامل کئے، اور چھوٹے چھوٹے دالانوں کو وسیع کیا، اور اس میں ایک نہر لایا، اس سے شفاخانہ کی عمارت بہت خوبصورت ہوگئی،(۴۴)

دوسری ترمیم مصر کے بادشاہ ملک منصور سیف الدین قلاوون کے زمانہ میں ہوئی، اسکی شکل یہ پیش آئی کہ ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء میں سیف الدین قلاوون شام کا گورنر مقرر ہوا، مگر وہاں پہونچکر اسکو قولنج کا سخت درد اٹھا، طبیبوں نے شفاخانہ نوریہ کی دواؤں سے اس کا علاج کیا، اور وہ اچھا ہوگیا، اس کے صلہ میں جب وہ مصر کا بادشاہ ہوگیا، تو اس نے شفاخانہ کے نگراں کو اسکی مرمت کا حکم دیا، چنانچہ اسکی یادگار میں اندرونی دروازہ کے اوپر سنگ مرمر کی ایک تختی دیوار میں لگائی گئی، جو اب تک موجود ہے، اور اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے،

وسح سنة اثنين وثمانين وستمائة	سنہ چھ سو بیاسی (۶۸۲ھ)
بسم الله الرحمن الرحيم والذين	بسم اللہ الرحمن الرحیم، وہ لوگ جو اپنے
ينفقون اموالهم في سبيل الله ثم	مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں،
لا يتبعون ما انفقوا منا ولا اذى لهم	پھر خرچ کے پیچھے احسان جتاتے ہیں، اور
اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم	نہ تکلیف دیتے ہیں، ان کے لیے ان کے
ولا هم يحزنون وما تقدموا	پروردگار کے نزدیک ان کا اجر ہے
لانفسكم من خير تجدوه عند الله	نہ ان کو کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین

هو خیرا و اعظم اجرا و قال رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا مات
ابن آدم انقطع عملہ الا من ثلاث
علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعو لہ
او صدقۃ جاریۃ و المولی
السلطان الغازی فی سبیل اللہ
نور الدین ابو الثنا محمود بن زنگی
آق سنقر قدس اللہ روحہ من
جمع اللہ سبحانہ وتعالی لذاتہ وصف
العالمین ومن شرط وقفہ الذی
اشہد بہ علی نفسہ انہ وقف
علی المارستان المعروف بانشائہ
وجعلہ مقرا لذوی الفقراء و
المنقطعین من ضعفۃ المسلمین الذین
یرجا (یرجی) برؤھم وھو سبیلہ
الی اللہ تعالی من یساعد فی تغییر
مصارف وقفہ واخراجہا عما
شرطہ وبخاصمہ بین یدیہ
"یوم تجد کل نفس ما عملت من

ہوں گے، اور تم اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی
بھی طیار رکھو گے اسکو خدا کے نزدیک بہتر اور
بہت بڑی اجر والی پاؤ گے، اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب انسان
مرجاتا ہے، تو تین کے سوا باقی اس کے سب
اعمال ختم ہو جاتے ہیں، ایک وہ علم جس سے
فائدہ اٹھایا جائے، یا وہ نیک لڑکا جو اسکے
لئے دعا کرتا ہے، یا وہ صدقہ جو جاری
رہے، اور مولی سلطان غازی فی سبیل اللہ
نور الدین ابو الثنا محمود بن زنگی آق
سنقر قدس اللہ روحہ نے جن کی ذات
میں اللہ سبحانہ وتعالی نے دنیا بھر کے
عمدہ اوصاف جمع کر دیئے ہیں، یہ شرط
لگائی ہے کہ اس وقف کی آمدنی جس پر انھوں
نے اپنے نفس کو گواہ ٹھہرایا ہے، صرف
اسی شفاخانہ پر صرف ہو، اور اس شفاخانہ
کو فقیروں اور ان کمزور و لاچار مسلمانوں
کے لئے خاص، جن کے اچھے ہونے کی امید کی جاتی
ہے، دوا اور علاج کا ذریعہ مقرر کیا ہے

خیر محضرا وما عملت من سوء
تود لو ان بینہا وبینہ امدا بعیدا
وجدد ما کان تہدم من
بنیانہ ونماء اوقافہ فی الایام
السلطانیۃ العادلیۃ الصالحیۃ،
خلد اللہ سلطانہا بنظر الفقیر
الی اللہ تعالی عمر بن ابی الطیب
غفر اللہ لہ ولمن اعان من المسلمین
علی عمارۃ ھذا الوقف المبارک
وکان الفراغ منہ فجر العشر الاول
من ربیع الثانی سنۃ ۶۸۲

اور اس دن جب کہ ہر نفس اپنی کی ہوئی
بھلائی اور برائی کو اپنے روبرو پائے گا
اور آرزو کریگا کہ کاش اسکے اور اسکے
برے عمل کے درمیان بہت دور کا فاصلہ
ہوتا، خدا کے سامنے اس شخص کو اپنا خصم
اور مدعا علیہ ٹھہرایا ہے، جو وقف کی آمدنی
میں تغییر و تبدل کرنے کی کوشش کرے
یا اس کو کسی غیر مستحق پر صرف کرے، اور
سلطان عادل (سیف الدین قلاؤن)
خلد اللہ سلطنتہ کے زمانہ میں فقیر عمر بن
ابی الطیب (خدا اسکی اور ان تمام مسلمانوں
کی مغفرت کرے جنھوں نے اس مبارک
وقف کی عمارت پر اپنی رقم صرف کی)
کی زیر نگرانی اس عمارت کے منہدم شدہ
حصوں کی مرمت ہوئی، اور اس کے اوقاف
کی تنظیم ہوئی، اور اس کام سے ربیع الثانی
سنہ ۶۸۲ھ کے پہلے عشرہ میں فراغت حاصل ہوئی۔

سب سے اخیر اٹھارہویں صدی عیسوی میں حسن بادشاہ ترکی المعروف بشوریزی حسن نے
شفاخانے کی مرمت کرائی، یہ شفاخانہ سنہ ۱۳۱۷ھ مطابق سنہ ۱۸۹۹ء تک اچھی حالت میں رہا، اور
اسکے طبیبوں اور دواسازوں کی تعداد کبھی بیس سے کم نہیں ہوئی، یہانتک کہ دمشق کی میونسپلٹی

نے مستنفی الغربار کے نام سے ایک نیا شفاخانہ کھولا، اور شفاخانہ نوریہ کی عمارت کو لڑکیوں کا سرکاری مدرسہ بنا دیا، [9]

پرانے اور نوری شفاخانے کا ذکر ابن جبیر کے سفر نامہ میں ہے، ۵۸۰ھ میں جب وہ دمشق پہونچا ہے، تو ان دونوں کے متعلق لکھتا ہے، کہ

"اس (دمشق) میں دو شفاخانے ہین، ایک نیا دوسرا پرانا، نیا شفاخانہ بہ نسبت پرانے کے بہت بڑا ہے اور اس کا مرجوعہ بھی پرانے شفاخانے سے زیادہ ہے، اس پر روزانہ پندرہ دینار صرف ہوتے ہیں، شفاخانہ کے منشیوں کے پاس ایک رجسٹر ہے، جس مین بیماروں کے نام اور ان کی دوا اور غذا کا خرچ لکھا جاتا ہے، ہر روز صبح سویرے طبیب بیماروں کے پاس آتے ہیں، اور ان کی حالت دیکھ کر اچھی دوا اور مناسب غذا کا حکم دیے جاتے ہیں،

دوسرا شفاخانہ بھی اسی طرح کا ہے، مگر نئے شفاخانہ کا مرجوعہ پرانے سے بہت زیادہ ہے، پرانا شفاخانہ جامع اموی کے پچھم طرف واقع ہے"، [12]

شفاخانہ نوریہ کی عمارت کی موجودہ حالت یہ ہے،

شفاخانہ نوریہ میں داخل ہونے کا دروازہ عمارت کی دکھن جانب ہی ہے، یہ دروازہ بہت شاندار اور بڑا ہے، اور عمارت کی دیوارون سے کچھ آگے کو ابھرا ہوا ہے، دروازہ کے اوپر نصف گنبد بنا ہوا ہے، جس پر عمدہ نقش کیا گیا ہے، اس گنبد کے نیچے یونانی طرز کی ایک چوکھٹ ہے، غالبًا یہ کسی قدیم یونانی عمارت سے لی گئی ہے، جسکو کسی ترمیم کے وقت عمارت میں لگایا گیا ہے، سامنے کی طرف دروازہ کے دونوں پھاٹک لوہے کی چادروں سے جن پر خوبصورت ہندسی نقوش بنے ہوے ہین، منڈھ دیئے گئے ہیں، اور ہر ایک پھاٹک کے بیچ میں لوہے کی موٹی کنڈی لگی ہوئی ہے،

جس سے دروازہ کی شان و شوکت اور بڑھ گئی ہے، دروازہ کا دوسرا رخ لکڑی کا ہے، اور اسکے کنارون پر بھدی لیکن پختہ گلکاری کی گئی ہے، اس دروازہ کے مشرقی جانب دیوار میں سے پانی کی چھوٹی سی نہر بہتی ہے، جو ۶۸۲ھ مطابق ۱۲۸۳ء میں عمارت کی مرمت کے سلسلہ مین جاری کی گئی تھی،

بیرونی دروازہ سے ایک راستہ ایک مربع دالان کی طرف جاتا ہے، جس پر ایک گنبد بنا ہوا ہے اور پورے گنبد پر مختلف قسم کے نقش و نگار ہیں بیرونی دروازہ کے بالمقابل ایک دروازہ ہے، جو مضبوطی اور خوبصورتی میں بیرونی دروازہ سے کسی طرح کم نہیں ہے، اوس کے اوپر سنگ مرمر کی وہ تختی لگی ہوئی ہے جسکا اوپر ذکر ہو چکا ہے،

پھر یہان سے راستہ تنگ برآمدہ سے ہوتا ہوا صحن کی طرف جاتا ہے، اس برآمدہ کے دونون طرف دو عظیم الشان مضبوط اور بڑے بالاخانے ہیں، یہان پہونچکر سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ ان بالاخانون کے دروازون کی چھوٹائی ہے، کیونکہ بالاخانوں کی وسعت اور ان کی چھت کی بلندی کو دیکھتے ہوئے ان کے دروازے بہت ہی چھوٹے ہیں،

صحن کا رقبہ ۴۰۰ مربع میٹر کے قریب ہے، اس صحن کے پورب اور پچھم طرف اوسط درجہ کے دو ایوان ہیں، جن کی دیواروں پر خوبصورت ہندسی نقوش ہیں، اس اخیر ترمیم کے زمانہ میں دونون ایوانون کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ چھوٹے معلوم ہونے لگے ہین، صحن کے سامنے ایک بہت بڑا اور کشادہ ایوان ہے، اس کی مشرقی اور مغربی دیواروں میں سے ہر ایک میں سنگ مرمر کی دو تختیاں لگی ہوئی ہیں، جن پر حسب ذیل قرآنی آیتیں لکھی ہوئی ہیں،

۱- "یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم و شفاء للناس لما فی

۲- الصدور یخرج من بطونھا شراب مختلف الوانہ (فیہ شفاء للناس

۳۔ فھو یھدین والذی ھو یطعمنی ویسقین،

۴۔ واذا مرضت فھو یشفین والذی اطمع لی ان یغفر لی خطیئتی"

شفاخانہ نوریہ کے اطباء ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب میں بہت سے اطباء کے حالات لکھے ہین، جنھوں نے ایک مدت تک شفاخانہ نوریہ کی خدمت انجام دی، اون کے مختصر حالات یہان لکھے جاتے ہیں،

۱۔ سب سے پہلا طبیب جسکو نور الدین نے اس شفاخانہ کا نگران مقرر کیا، وہ ابو علی ابو المجد ابن ابی الحکم عبید اللہ بن المظفر بن عبد اللہ الباہلی ہے، اسکو حکومت کی طرف سے روزینہ اور وظیفہ ملتا تھا، ابو الحکم اپنے زمانہ کا مشہور حکیم، بہترین عالم، فاضل طبیب اور علم ہندسہ اور نجوم کا بڑا ماہر تھا، وہ روزانہ سب سے پہلے شفاخانہ کے مریضوں کو دیکھتا تھا، ان سے فارغ ہونے کے بعد قلعہ کے اندر بیمار ارکین دولت کا معائنہ کرتا تھا، پھر وہان سے لوٹ کر شفاخانہ کے بڑے دالان مین بیٹھ جاتا تھا، نور الدین نے اس شفاخانہ کے لئے بہت سی طبی کتابیں وقف کی تھیں، جو صدر دالان کے دو کمرون میں رکھی گئی تھیں، شفاخانہ کے سارے اطبا اور ان کے شاگرد ابو الحکم کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے اور طبی مباحث پر بحث و گفتگو شروع ہوتی تھی، پھر شاگردوں کا درس ہوتا تھا، تقریباً تین گھنٹون تک اس بحث و گفتگو، درس و تدریس اور کتابوں کے مطالعہ کا شغل جاری رہتا تھا، اسکے بعد ابو الحکم اپنے گھر چلا جاتا تھا، ۵۷۰ھ کے کچھ سال بعد اس نے دمشق میں وفات پائی،[۳۵]

۲۔ شیخ مہذب الدین ابو الحسن علی بن ابی عبد اللہ عیسی بن ہبۃ اللہ النقاش، اس کی پیدائش اور نشو و نما بغداد میں ہوئی، عربی ادب کا بہت بڑا عالم تھا، فارسی بولتا تھا، امین الدولہ ہبۃ اللہ بن صاعد ابن التلمیذ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، پہلے دمشق آیا، پھر مصر گیا، پھر دمشق پہونچا، اور ملک عادل نور الدین کا معالج مقرر ہوا، اس نے شفاخانہ نوریہ میں بھی کام کیا تھا، ملک عادل کی وفات کے بعد صلاح الدین

ایوبی کا معالج مقرر ہوا، ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں وفات پائی، بڑا نیک اور خوشخصال تھا،[۳۶]

۳۔ موفق الدین ابو نصر اسعد بن ابی الفتح الیاس بن جرجس المطران، تمام حکماء کا سردار، بہت بڑا دولتمند اور اپنے زمانہ کا ممتاز طبیب تھا، صلاح الدین ایوبی کا معالج تھا، اس نے ابن المطران کو انعام و اکرام اور دولت و ثروت سے مالامال کر دیا تھا، اس کے علم و فضل کی بنا پر صلاح الدین اس کی بڑی قدر کرتا تھا، خود اسکو بھی اپنے علم و فضل پر بڑا ناز اور فخر و غرور تھا،

اس سلسلہ میں اسکے بعض جاننے والے یہ واقعہ بیان کرتے ہین، کہ وہ کسی لڑائی میں صلاح الدین کی فوج کیساتھ تھا، صلاح الدین کا خیمہ، دہلیز اور شقہ ہمیشہ سرخ رنگ کا ہوتا تھا، ایک دن صلاح الدین گھوڑے پر سوار تھا، اچانک اسکی نظر ایک اور سرخ خیمہ پر پڑی جسکی دہلیز اور شقہ دونوں سرخ تھے، کچھ دیر تک تو وہ اسکو بغور دیکھتا رہا، پھر دریافت کیا کہ یہ خیمہ کس کا ہے، سپاہیوں نے بتایا کہ طبیب ابن مطران کا ہے، صلاح الدین نے کہا، واللہ یہ ابن المطران ہی کی حماقت ہو سکتی ہے، یہ کہکر ہنسا پھر کہا اس پر تو قاصدوں کو بادشاہ کے خیمہ کا دھوکا ہو سکتا ہے، اگر خیمہ کا رنگ یہی رکھنا تھا، تو کم از کم اسکی دہلیز اور شقہ کا رنگ بدل دیا ہوتا، اور اس خیمہ کو اکھاڑنے کا حکم دیدیا، اسکی تعمیل ہوئی، ابن المطران کو یہ اتنا ناگوار ہوا کہ وہ مسلسل دو دن تک صلاح الدین کے دربار میں حاضر نہیں ہوا، آخر میں سلطان کو خود انعام و اکرام دیکر اسکی دلجوئی کرنی پڑی،

موفق الدین بڑا فیاض اور نیک کامون کے کرنے کا شیدا تھا، ہمیشہ اپنے شاگردوں کی امداد کرتا تھا، اس نے شفاخانہ نوریہ کی بیش بہا خدمت انجام دی، اسکے بہت سے شاگرد بڑے بڑے رتبوں پر پہونچے، اسکے ساتھ اس کا شاگرد مہذب الدین دخوار جو کچھ مدت کے بعد اسی شفاخانہ کا افسر الاطباء مقرر ہوا، طبیب عمران اسرائیلی، ابن ابی اصیبعۃ الکحال، اور ابن حمدان الجرائحی وغیرہ کام کرتے تھے، ابن حمدان الجرائحی تمام شاگردوں کے سامنے جراحی (آپریشن) کرتا تھا، اور ابن مطران اس

درمیان میں مریض کی نبض کی حرکت پر غور کرتا رہتا تھا،

ابن مطران کو کتابوں کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، اس کے انتقال کے وقت اسکے کتب خانے میں ان کتابوں کے علاوہ جو خود اس نے نقل کرائی تھیں تقریباً دس ہزار جلدیں تھیں، وہ کتابیں نقل کرانے کا بڑا شائق تھا، اس کے پاس ہمیشہ تین کاتب رہتے تھے جو اس کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب نقل کرتے رہتے، ان کا وظیفہ وہ اپنی جیب سے دیتا تھا،

ابن مطران نے بہت سی عمدہ طبی تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں مقالہ ناصریہ فی حفظ الامور الصحیۃ، کتاب آداب طب الملوک وغیرہ بہت مشہور ہیں، افسوس ہے کہ اسکی تمام کتابیں آج نایاب ہیں، بستان الاطبار و روضۃ الالبا کے نام سے ایک بہترین کتاب لکھ رہا تھا، مگر یہ کتاب ابھی پوری نہ ہونے پائی تھی، کہ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں موت نے اس کا خاتمہ کر دیا،

۴- موید الدین ابوالفضل محمد بن عبد الکریم بن عبد الرحمن الحارثی المعروف المہندس دمشق میں پیدا ہوا، اور وہیں نشو و نما پائی، ابتدا میں وہ نجاری اور سنگتراشی کا کام کرتا تھا، شفاخانہ نوریہ کے دروازے اسی نے بنائے تھے، دمشق کی جامع اموی کی گھڑیوں کو بھی یہی درست کرتا تھا، اسکا باپ بھی یہی کام کرتا تھا، موید الدین چند دنوں تک اس شفاخانہ کا طبیب بھی تھا، اور اسکو وظیفہ ملتا تھا، ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی،

۵- موفق الدین عبد العزیز بن عبد الجبار بن ابی محمد السلمی بہت نیک اور با مروت تھا، عام طور پر ہر بیمار کے ساتھ خصوصاً نازک مریضوں پر بڑی مہربانی کرتا تھا، پورے غور و فکر کے بعد بیماروں کا علاج کرتا تھا، اگر خرچ کے لئے ان کے پاس روپیہ نہ ہوتا تو روپیہ سے انکی مدد کرتا، ان کے لئے دوا اور غذا کا پورا انتظام کرتا تھا، اس نے شفاخانہ نوریہ میں کچھ دنوں تک کام کیا، اسکے بعد ملک عادل ابوبکر بن ایوب کا معالج مقرر ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ شفاخانہ کا

افسر الاطبا بھی تھا کیونکہ جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا، مہذب الدین الدخوار نے اسی جگہ ۶۲۸ھ/۱۲۳۰ء میں وفات پائی،

۶- رضی الدین ابوالحجاج یوسف بن حیدرہ بن الحسن الرحبی مہذب الدین النقاش کا شاگرد اور صلاح الدین ایوبی اور اسکے بھائی ملک عادل ابوبکر بن ایوب کا معالج تھا، قلعہ اور شفاخانہ کے بیماروں کے لئے مخصوص تھا، اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ "سیڑھیاں عمر کا آرہ ہیں" اسکا یہ بیان بھی دلچسپ ہے کہ "جب سے میں نے یہ گھر خریدا ہے پچیس سال سے زیادہ عرصہ سے سکونت پذیر ہوں، مجھے یاد نہیں آتا کہ میں ایک مرتبہ کے سوا کبھی اسکے بالاخانہ پر چڑھا ہوں، اور وہ بھی جب پہلے پہل اسکو خریدا تھا،

شفاخانہ نوریہ میں سن و سال قدر و منزلت اور علم و فضل کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر کوئی طبیب نہ تھا، یہ ان ماہر استادوں میں سے ایک تھا جن سے طب کے شائق طلبہ فن طب کی تحصیل کیا کرتے تھے، مہذب الدین الدخوار اور حکیم عمران اسرائیلی اسکے معاون تھے، سو برس کی عمر پاکر ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں انتقال کیا،

۷- کمال الدین ابو منصور المظفر بن علی بن ناصر القرشی، بڑا نیک با مروت اور شریف النفس تھا، شیخ رضی الدین رحبی سے طب پڑھی تھی، برسوں شفاخانہ کے بیماروں کا علاج مفت کرتا رہا، آخر میں اسکو مجبور کر کے اس کا وظیفہ اور روزینہ مقرر کیا گیا، ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں دنیائے فانی سے رحلت کی،

۸- شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبدان بن عبد الواحد اللبودی حکمت اور فن طب میں اپنے زمانہ کا ممتاز ترین شخص تھا، ان دونوں فنوں کی تحصیل کے لئے شام اور عجم کے شہروں کا سفر کیا اور وہاں نجیب الدین اسعد الہمدانی سے حکمت کی، اور ایک بہت بڑے عالم سے جو فن طب میں

سید ایلاقی محمد کے شاگرد ابن سہلان کا شاگرد تھا، طب کی تعلیم حاصل کی، بڑا باہمت، سلیم الفطرت اور ذہین تھا، اسکی ایک خاص درسگاہ تھی جس میں وہ طلبہ کو طب کی تعلیم دیتا تھا، ملک ظاہر غیاث الدین غازی ابن صلاح الدین کا معالج تھا، اور حلب میں ملک ظاہر کیساتھ رہتا تھا، غیاث الدین کی وفات کے بعد دمشق آیا، اور شفاخانہ نوریہ کا طبیب ہوا، اکاون[51] برس کی عمر میں ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء میں وفات پائی، اس نے بہت سی تصنیفیں کی تھیں،[41]

۹۔ مہذب الدین احمد بن الحاجب دمشق میں پیدا ہوا، کچھ دنوں تک موصل میں رہا، پھر دمشق جاکر طب پڑھنی شروع کی، اور اس میں کمال پیدا کیا، اور بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، علوم ریاضیہ کا بھی بڑا ماہر تھا، ادب سے خاص ذوق رکھتا تھا اسکی بہت سی عمدہ تصنیفات ہیں، صلاح الدین ایوبی اور شفاخانہ نوریہ کا طبیب تھا، پھر حماۃ گیا، اور دو سال تک ملک منصور کا معالج رہا، استسقا کی بیماری میں وفات پائی،[42]

۱۰۔ مہذب الدین ابو محمد عبد الرحیم بن علی بن حامد الدخوار، اسکی پیدائش اور نشوونما دمشق میں ہوئی، وہ اور اس کا باپ آنکھ کے علاج میں بہت مشہور تھے، شروع میں اوس نے صرف آنکھ کے علاج کا فن سیکھا تھا، پھر جب شفاخانہ نوریہ میں آنکھوں کی بیماریوں کا معالج مقرر ہوا تو شیخ رضی الدین الرحبی، موفق الدین المطران اور فخر الدین المارديني سے طب پڑھنی شروع کی، ملک عادل ابو بکر بن ایوب کا معالج تھا، اور اس کے زمانہ تک فوج کے مریضوں کا بھی علاج کرتا تھا،

افسر الاطباء موفق الدین عبد العزیز کے انتقال کے بعد یہی اس کا جانشین ہوا، اور اسکو حکومت کی طرف سے وظیفہ اور روزینہ ملنے لگا، اسنے شفاخانہ نوریہ کی بہترین خدمات انجام دین، وہ رشید الدین الصوری، عمران الاسرائیلی، ابن ابی اصیبعہ، مہذب الدین ابن الحاجب اور شیخ رضی الدین الرحبی کا معاصر تھا،

جب ملک عادل نے مصر کا رُخ کیا، تو اسکو بھی ساتھ لیتا گیا، اور اسکو مصر و شام کے تمام طبیبوں کا افسر مقرر کیا، باپ کی وفات کے بعد جب شام کی سلطنت ملک معظم کے قبضہ میں آئی، تو اس نے مہذب الدین دخوار کو بلاکر اس کا وظیفہ مقرر کرکے شفاخانہ نوریہ کا طبیب مقرر کیا،

مہذب الدین نے اپنے گھر میں طب کی تعلیم کے لئے ایک درسگاہ قائم کی تھی جسمیں بڑے بڑے طبیب اس سے درس لیتے تھے، درس و تدریس سے فراغت کے بعد فاضل وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا،

مہذب الدین دخوار نے اپنے بعد اپنا گھر طبی مدرسہ کے لئے وقف کر دیا، اور اسکے لئے بہت سی جاگیریں اور مکانات وقف کئے، کہ مدرسین اور طلبہ کو روپیہ کی کمی نہ ہو اس نے یہ بھی وصیت کی تھی، کہ حکیم شرف الدین علی بن الرحبی اس مدرسہ میں درس دیا کریں، چنانچہ حکیم مذکور نے ۶۲۸ھ میں حکیم سعد الدین ابراہیم ابن الحکیم موفق الدین عبد العزیز اور بڑے بڑے فقہاء و حکماء کے سامنے درس کا آغاز کیا، اور برسوں مدرسہ میں درس دیتے رہے،[43]

مہذب الدین نہایت اچھا شاعر تھا، اپنے بعد طب اور لغت مین بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں،

۱۱۔ ابو الثناء محمود بن عمر بن محمد بن ابراہیم بن شجاع الشیبانی الحانوی المعروف بابن رقیقہ، یہ ابن ابی اصیبعہ کا گہرا دوست تھا، اس نے بڑے مدحیہ الفاظ میں ابو الثناء کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے[45]

"ابو الثناء نہایت بہتر اور با مروت انسان تھا، اپنے ہمعصر طبیبوں اور حکیموں میں ممتاز تھا، اسکی فطرت سلیم اسکی گفتگو میٹھی، اسکی نظم بلیغ اور اسکے اشعار نادر ہوتے تھے، وہ ۵۶۴ھ میں شہر حیینی میں پیدا ہوا، اور وہیں نشوونما پائی تھی، بہت بڑا طبیب، امراض چشم کا ماہر اور جراح تھا، کئی بادشاہوں اور امیروں کی خدمت کی جب ۶۳۲ھ میں وہ دمشق آیا، تو ملک اشرف

نے اسکی بڑی عزت و تکریم کی، اور اسکو اندرون قلعہ شاہی محلوں کے بیماروں کے دیکھنے اور شفاخانۂ نوریہ کے مریضوں کا علاج کرنیکا حکم دیا! اور اسکا وظیفہ اور روزینہ مقرر کر دیا، ۶۳۵ھ ۱۲۳۷ء میں وفات پائی،

۱۲- اوحد الدین عمران بن صدقۃ الاسرائیلی اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ ۵۶۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوا، اس کا باپ بہت بڑا طبیب تھا، عمران نے شیخ رضی الدین الرحبی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، وہ اپنے زمانہ کے چوٹی کے طبیبوں میں گنا جاتا تھا، اسکو بادشاہوں کی صحبت اور انکا تقرب حاصل تھا، اور اسکی تشخیص پر وہ بہت بھروسہ رکھتے تھے، بہت سے بادشاہوں نے اسکی خدمات حاصل کیں، اس نے طبی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا، کہ اس میں کوئی دوسرا شخص اسکی برابری نہیں کر سکتا تھا، دخوار اور ابن ابی اصیبعہ کے زمانہ میں یہ بھی شفاخانہ نوریہ کا بہت بڑا طبیب تھا، ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء میں وفات پائی،

۱۳- سعد الدین ابو اسحٰق ابراہیم بن عبد العزیز بن عبد الجبار بن ابی محمد السلمی یہ عبد العزیز کا لڑکا ہے، جس کا ذکر نمبر ۵ میں ہو چکا ہے، ۵۸۳ھ میں بمقام دمشق پیدا ہوا، شفاخانہ نوریہ کا طبیب تھا، اور کئی ایک بادشاہوں اور امیروں کا معالج بھی رہا، ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء میں وفات پائی،

(باقی)

ابن رشد

مشہور مسلمان اندلسی حکیم جو مسلمانوں میں ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح سمجھا جاتا ہے، اور جسکی تصنیفات مدتوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں، سوانح اور اس کے فلسفہ پر تبصرہ اور اسی ضمن میں مسلمانوں کے علم کلام و فلسفہ پر بھی ریویو، اور یورپ میں اسلامی علوم کی اشاعت کی تاریخ اور فلسفۂ جدیدہ و قدیمہ کا موازنہ بھی آگیا ہے، ابن رشد کے متعلق اتنا بڑا ذخیرۂ معلومات کسی مشرقی زبان میں کیا کسی مغربی زبان میں بھی نہیں مل سکتا، ضخامت ۳۰۵ صفحے قیمت سے ر "منیجر"

نواب داؤد خان صوبہ دار بہار

اور

جنگ پلاموں کا نادر مرقع،

از جناب حافظ سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

(۲)

داؤد خان کی قدر افزائی اور اس کی کارگذاریوں کا صلہ

غرہ شعبان ۱۰۷۱ھ میں پلاموں کے مال غنیمت میں سے دو زنجیر فیل بادشاہ عالمگیر کی نظر سے دہلی میں گذارے گئے،

داؤد خاں کی کارگذاریوں کے صلہ میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۰۷۲ھ کو بادشاہ نے باضافہ منصب چار ہزاری چار ہزار سوار دو ہزار دو اسپہ سہ اسپہ مقرر کئے،[۱]

اسکے علاوہ پرگنہ انچھا[۲] مضاف صوبہ بہار میں موازی چار ہزار بگیہ زمین قصبہ داؤد نگر کے آباد کرنے کے لئے التمغا عطا ہوئی، اور پرگنہ انچھا، گوہ و منورہ من مضاف صوبہ بہار معافی سلامی و نذرانہ سالانہ اخراجات کے لئے عطا کئے جانے کا فرمان صادر ہو،

ان فرامین شاہی کی نقلیں جو نواب داؤد خان، اور اسکی اولاد و احفاد کو ملے

نقل فرمان[۳] شاہ بلند اقبال محمد دارا شکوہ ابن شاہجہان بادشاہ غازی،

[۱] عالمگیر نامہ ص ۵۶۵، [۲] بیاض فارسی و فرامین شاہی، [۳] مہر سرنامہ اشرفی نما سیاہ دستخط شاہی چار گوشہ مطلا روشن اعراب و حرکات شنجرفی کا غذ ہلکا بادامی سمرقندی کا طول ۳ فٹ عرض ڈیڑھ فٹ، پشت

الله

طغرا چہار گوشہ مطلا بخط نسخ	مہر چہار گوشہ مطلا بخط نسخ
محمد داراشکوہ ابن المظفر بادشاہ	محمد داراشکوہ شاہ بلند اقبال
شاہجہاں غازی	شاہ عالی پناہ

فرمان شاہ داراشکوہ

"متصدیان مہمات حال و استقبال بلدۂ حصار بعنایت شاہانہ امیدوار بودہ بدانند کہ چوں موازی یکہزار بیگہ زمین بنجر افتادہ خارج جمع از سواد بلدۂ حصار بطریق انعام شجاعت و شہامت پناہ لائق العنایت والاحسان داؤد خان مطابق ضمن مرحمت فرمودہ ایم، می باید کہ موازی مذکور از محل مزبور پیمودہ حوالہ داؤد خاں مشارٌ الیہ نمایند کہ در آنجا موضعے و سرائے، باغے بسازد و در آباد نمودن او[1]...... و ترتیب باغ دران زمین خان مومی الیہ را مختار شناسند"

(تحریراً فی تاریخ دوازدہم صفر سنہ ۱۰۶۷ھ)

سرنامہ

اللہ اکبر

(مہر مدور سیاہ)	(طغرا مطلا چہار گوشہ)

محمد اورنگ زیب شاہ بہادر غازی

ابن صاحبقران شاہجہان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۳) فرمان پر عمال سررشتہ کی تصدیقی کارروائی ہے جس پر معتمد خاں وغیرہ کے دستخط ہیں، اس فرمان سے داراشکوہ کی ملازمت کی تصدیق اور اسکی قدردانی اور قدر افزائی کا ثبوت ملتا ہے، صدر فرمان کا سنہ وہی ہے جبیں داؤد خاں داراشکوہ کی ملازمت ترک کرکے اپنے وطن حصا فیروزہ چلا گیا ہے۔ [1] اس جگہ ایک دو لفظ نہیں پڑھے جا سکے

فرمان اورنگزیب

دریں[1] وقت فرخندہ منشور سعادت گنجور شرف صدور و عز ظہور یافت کہ موازی یکہزار بیگہ زمین بجہت آبادانی و سرائے و ترتیب باغ از پرگنہ حویلی حصار (حویلی حصار) در وجہ انعام بجہت شجاعت و شہامت دستگاہ شایستہ مراحم بیکراں داؤد خاں با فرزندان بموجب ضمن مقرر و مفوض باشد، می باید حکام و عمال و متصدیان مہمات دیوانی در استمرار و استقرار ایں حکم معلی کوشیدہ اراضی مذکورہ را پیمودہ بتصرف آں شجاعت شعار و فرزندانش بازگذارند، دریں باب تاکید اکید دانند"

(تاریخ ۲۲ شہر رجب المرجب سنہ ۱۰۶۹ھ نوشتہ شد)

سرنامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مہر مدور سیاہ	مطلا
اعظم شاہ بن محمد عالمگیر	طغرا چہار گوشہ کلاں
بادشاہ غازی،	طغرا چہار گوشہ شنجرفی متوسط

فرمان اعظم شاہ،

دریں[2] ایام خجستہ آغاز میمنت انجام امر جلیل القدر، کرامت انتظام عالی متعالی عز نفاذ

[1] یہ فرمان داراشکوہ کے فرمان کی تصدیق و تاکید ہے، کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، ان فرامین کی کتابت نستعلیق عمدہ، حروف روشن، مگر امتداد زمانہ سے جابجا حروف دھندلے اور مٹ گئے ہیں، کاغذ ہلکا بادامی سمرقندی چکنا، طول ۲ فٹ، عرض ڈیڑھ فٹ، پشت فرمان پر بخط دیوانی سررشتہ و عمال کی تصدیقی کارروائی، اور بعد کے بادشاہوں کی تصدیقیں ہیں، ایک جگہ سنہ و دستخط بنام سلطان بہادر سنہ ۱۰۶۹ھ مکتوب ہے۔

[2] یہ فرمان داؤد خاں کی وفات کے بعد انکی بیوی نور النساء کو باضافہ زمین قابل زراعت معافی عطا کیا گیا تھا، اراضی لائق زراعت کی تفصیل فرمان کی پشت پر خط شکست میں مرقوم ہے، اور عمال و حکام کی تصدیقی دستخطیں ثبت ہیں، فرمان کی کتابت خط نستعلیق میں ہے جابجا سے حروف مٹے ہوئے ہیں،

یافت کہ موازی پانصد وبست بیگہ زمین افتادہ خارج جمع لائق زراعت بگزالمی از پرگنہ
حصار من مضاف صوبہ دار الخلافہ شاہجہان آباد، از ابتدائے فصل خریف ..... زیب
سبیل در وجہ مدد معاش مسماۃ نور النساء وغیرہا، از متعلقات داؤد خان مرحوم حسب الضمن
مرحمت فرمودیم، کہ محصول آن را صرف معیشت نمودہ بدعاے بقائے ایام دولت جاوید طراز
ابد اتصال اشتغال نمودہ باشند، باید کہ حکام مال ومتصدیان حال واستقبال آراضی مسطورہ
راپیمودہ وچک بستہ بتصرف آنہا باز گذارند، واصلاً ومطلقاً تغیر وتبدل بدان راہ ندہند
وبہ علت مال وجہات وسائر اخراجات مثل قلعہ پیشکش وجریانہ وضابطانہ ومحصلانہ و
ہرانہ ودار وغگانہ وبیکار وشکار نمودہ ...... صدوری ومقدمی وقانون گوئی وضبط ہر
سالہ بعد چکبندی وتکرار زراعت وکل مطالبات سلطانی تکالیف دیوانی مزاحم ومتعرض
نگردیدہ درین مادہ ہر سال سند مجدد نطلبند، واگر در محل دیگر چیزے یافتہ باشند آن را اعتبار
نمایند تاریخ چہاردہم شہر شوال سنہ سی دہشت از جلوس والا زیب تحریر یافت"

فرمان بادشاہ محمد شاہ غازی
بوسیلہ فدوی مسیح خان

مہر کلاں مدور سیاہ تحریر، مہر فدوی مسیح خان بادشاہ غازی
محمد شاہ سنہ ۱۱۴۳ھ،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵) جو خط منقوط میں دکھائے گئے ہیں کاغذ شامی ہلکا بادامی یا صندلی ہے، طول چار فٹ عرض دو فٹ۔
۱؎ اس فرمان سے ظاہر ہے کہ عہد عالمگیری میں داؤد خاں کو بطور انعام چار ہزار بیگہ زمین قصبہ داؤد نگر کے آباد کرنے اور دوسری ضروریات مندرجہ کے لئے عطا کی گئی تھی، اس کے بعد شرح مذکور حمید خان پسر داؤد خان وحمید خان ثانی واحمد خان نبائر داؤد خاں کے نام بحال ومقرر ہوئی، شرح فرمان اور تفصیل اراضی پشت فرمان پر مذکور ہے، جن پر عمال وحکام کے تصدیقی دستخط ہیں، فرمان وتحریر سررشتہ خط دیوانی میں ہے، کاغذ اروئی کھردرا طول ۵ فٹ عرض ایک فٹ۔

"چودھریان وقانون گویان ومتصدیان ورعایا ومزارعان پرگنہ انچھا وغیرہ مضاف صوبہ
بہار بدانند کہ پروانہ درگاہی میر جملۃ الملک مدار المہام وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین
خان بہادر نصرت جنگ تحریر نوزدہم جمادی الاول سنہ ۲۳ جلوس باین مضمون ورود یافتہ
کہ موازی چہار ہزار بیگہ زمین برائے آبادی قصبہ داؤد نگر وبواسطہ خرچ محافظان آن در آن
آنجا بموجب فرمان والا شان بادشاہ عہد غفران پناہ جنت آرام صاعد مصاعد قرب اسکنہ
اعلی درجات الجنان حضرت مرقوم ششم ربیع الثانی سنہ وجہ انعام داؤد خان مرحوم
مقرر بودہ در سنہ ۴۹ بازیافتہ شدہ یک لک وشصت وچہار ہزار دام بابت بازیافت
مسطور بر جمع پرگنہ افزودہ بہ تنخواہ در آمدہ من بعد در عہد بدستور سابق در وجہ انعام حمید خان
واحمد خان نبائر داؤد خان مرحوم بدستور عہد آنحضرت بموجب یادداشت تحریر دہم جمادی
الاول سنہ ۶ بحال شدہ فرمان والا شان در عہد مسطور سوم جمادی الاول سنہ احد مرحمت
گردیدہ دران ہنگام از جمع پرگنہ وتنخواہ جاگیردار منہا شد، وکیل احمد خان وغیرہ نبائر
داؤد خان مرحوم التماس دارد کہ دیوانیان برائے منہائی دام مزبور مزاحمت میرسانند
امیدوارند کہ از جملہ جاگیر موکلاں بموجب فرامین واگذاشت نامہ کہ بمہر موکلان رجوع
نمودہ، پروانہ منہائی بنام دیوان صوبہ مرحمت شود، از آن جا از روے سررشتہ دفتر اعلی
بوضوح پیوست کہ پرگنہ مزبور بجمع تنخواہ مبلغ دوازدہ لک وشصت وشش ہزار دام
از اصل واضافہ در بست بجاگیر احمد خان وغیرہ است، درین ولا احمد وغیرہ برائے منہائی
دام مسطور منجملہ جاگیر خود من ابتدائے خریف ..... سال سنہ ۱۱۴۹ فصلی فرد گذاشت نوشتہ
داد لہذا انگاشتہ می آید کہ آن کفایت دستگاہ دو ہزار بیگہ زمین بموجب فرمان مطاع
بحال داشتہ عوض آن یک لک وشصت وچہار ہزار دام حسب الضمن از جمع پرگنہ جاگیر

جاگیر وار منہا نماید در سررشتہ دیوانی صوبہ ثبت گردانند، چنانچہ برطبق پروانہ درگاہی دو ہزار بیگہ زمین بموجب فرمان مطاع بحال داشتہ عوض آن یک لک وشصت وچہار ہزار دام از جمع پرگنہ وجاگیر جاگیرداران منہا شدہ، در سررشتہ دیوانی صوبہ ثبت گردانیدہ باید کہ بروفق پروانہ حضور پر نور فرمان والاشان کہ شرح آن در ظہر راقم یافتہ بعمل آوردہ، دو ہزار بیگہ زمین بحال داشتہ عوض آں یک لک وشصت چہار ہزار دام از جمع پرگنہ وجاگیر جاگیرداران منہا ساختہ در سررشتہ پرگنہ داخل نماید درین باب تاکید دانند تاریخ شوال ۲۵ سنہ جلوس،

فرمان محمد شاہ بوسیلہ فدوی عسکر خاں	مہر مدور سیاہ تحریر مہر فدوی عسکر خان محمد شاہ بادشاہ غازی سنہ ۱۱۳۰ھ،

موازی[1] چہار ہزار بیگہ زمین از پرگنہ انچھا وغیرہ کہ در وجہ انعام داؤد خان، مرحوم جد حمید خان واحمد خان پسران داؤد خان شہید قریشی کہ در جنگ سلطانی بکار آمدہ مقرر بود صادر شد کہ آراضی مذکور از محل قدیم در وجہ انعام آنہا مقرر باشد، کہ حاصل آن را صرف معیشت نمودہ بدعاے بقاے دولت روز افزوں مواظبت نمایند، حکام وعمال جاگیرداران وکروران ارضی مسطور محل قدیم تصرف آنہا بازگزارند، اصلا مطلقاً تغیر وتبدیل بدان راہ ندہند، ومحصولات مقررہ مزاحم نشوند، وہر سال سند مجدد نہ طلبند، چہار ہزار

[1] اس فرمان سے بھی عالمگیر کے فرمان کی تصدیق ہوتی ہے، اور چند مزید باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ داؤد خاں نے جنگ سلطانی میں شہادت پائی، دوسری یہ کہ اس مقام کا جہاں داؤد نگر آباد ہے، موضع سلوٹا کھوری نام تھا، اور صرف پرگنہ انچھا نہیں، بلکہ پرگنہ انچھا و منورہ دونوں انعامی معافی تھے، فرمان کی کتابت خط دیوانی میں ہے، تفصیلات آراضی اور سررشتہ کی کارروائی پشت فرمان پر مرقوم ہیں، کاغذ اودی کھرور اسفید طول ۲ فٹ عرض ایک فٹ،

بیگہ زمین ازاں جملہ دو ہزار بیگہ از پرگنہ انچھا و دو ہزار بیگہ از پرگنہ منورہ بموجب فرمان والاشان عہد حضرت در وجہ مدد معاش متعلقان داؤد خان مرحوم مقرر شدہ بود، خان مرحوم دو ہزار بیگہ از موضع سلوٹا وکھوری معمولہ پرگنہ انچھا چک بست نمودہ قصبہ داؤد نگر آباد ساختہ، برطبق فرمان والاشان موازی چہار ہزار بیگہ زمین محل قدیم در وجہ انعام حمید خان واحمد خان مقرر شد، دو ہزار بیگہ از قصبہ داؤد نگر معمولہ پرگنہ انچھا از سابق چک بست و دو ہزار بیگہ پرگنہ منورہ چک بست نمودہ،

(تاریخ بست و دویم ربیع الثانی سنہ ۳۰ جلوس)

فرمان شاہ عالم بادشاہ بوسیلہ فدوی سید رحیم الدین علی خاں بہادر	مہر مدور کلان سیاہ تحریر مہر فدوی سید رحیم الدین علی خان بہادر مہابت جنگ شجاع الملک حسام الدولہ شاہ عالم بادشاہ غازی سنہ ۱۱۷۵ھ

متصدیان[1] مہمات حال واستقبال وچودھریان وقانون گویان ومقدمان ورعایا ومزارعان قصبہ داؤد نگر عملہ پرگنہ انچھا ومنورہ وگوہ صوبہ بہار بدانند بوضوح پیوست کہ قصبہ مذکور وغیرہ دیہات از سابق در وجہ انعام التمغا وغیرہ بنام بیوہاے متعلقان نواب داؤد خاں مرحوم بمعافی سلامی ونذرانہ وغیرہ مقرر بغرض تصرف است لہذا دیہات مذکور را بدستور سابق در علاقہ شہامت وعوالی مرتبت محمد شکر اللہ خان بہادر وغلام غوث خاں بہادر وغیرہ وارثان وبیوہاے ب الضمن مقرر وبحال شد، باید کہ دیہات مذکور بدستور سابق بدخل موی الیہما واگذارند وبوجہے من الوجوہ خلاف معمول مزاحمت

[1] اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرگنہ انچھا و منورہ کے ہمراہ پرگنہ گوہ بھی معافی میں تھا، نواب داؤد خاں کی اولاد واعزہ میں نواب شکر اللہ خاں، غوث خاں اور حمید خاں کے نام پر بسے ہوئے مواضعات اب تک موجود ہیں،

نرسانند کہ حاصلات آنرا تصرف بانجاح خود ہا دادہ باشند، دریں باب تاکید اکید دانند"

(تاریخ بست و ہفتم شہر شعبان المعظم سنہ قلمی شد)

فرمان بادشاہ غازی محمد فرخ سیر بوسیلہ فدوی عسکر خاں	مہر گول بڑی سیاہ تحریر مہر فدوی عسکر خان بادشاہ غازی محمد فرخ سیر سنہ ۱۱۲۵ھ سنہ ۲ جلوس،

"چوں[۱] حسب الحکم اشرف اقدس اعلی بمہر نواب قطب الملک یمین الدولہ تحریر نوزدہم ذیحجہ سنہ ۳ جلوس والا صوبہ داری و فوجداری ہائے صوبہ بہار بعہدۂ امارت و بسالت مرتبت شوکت و حشمت منزلت نواب معتمد الملک میر جملہ معظم خان خاناں بہادر قطعہ جنگ مقرر شد و تعلق ارشاد درگاہی بمہر اقضی القضاۃ شریعت خان قاضی حضور پر نور بود فرا شدہ و مقرر گشتہ فدوی بارگاہ والا..... نیابتہً بندوبست مہام صوبہ داری و فوجداری و مشرو طہاے کماینبغی پردازد، چنانچہ مضمون عنایت نامہ نواب معتمد الملک کہ بفدوی درگاہ فلک اشتباہ رسید این است کہ سیادت و شہامت پناہ سید عرب خان بموجب حکم معلی بحضور پر نور می آیند، نیابت بآن عوالی پناہ مقرر است، در محافظت بودہ، و انتظام محالات فوجداری ہاے کماینبغی پردازند، و محصولات محالات مشروطا فوجداری ہائے را بتحصیل درآرند، لہذا نیابتہً فوجداری پرگنہ انچھا وغیرہ سرکار و صوبہ مزبور بعہدۂ رفعت عوالی پناہ حمید خاں حسب الضمن مقرر و مفوض گشت، کہ بلوازم مراسم خدمت مزبور براستی و دیانت پرداختہ در ضبط و ربط و نظم و نسق محال و تادیب مفسداں و ہدم قلاع آن فریق و حفظ و حراست زیر دستاں و مالگذاران و منع آہنگراں از ساختن بندوق و مسکرات و منہیات و محافظت طرق و شوارع واقعی بکوشد، الختصر باید کہ چودہریاں

[۱] یہ فرمان حمید خاں پسر داؤد خاں مرحوم کی نیابت فوجداری پرگنہ انچھا وغیرہ کو صاف ظاہر کرتا ہے، الخ مختصر اس کا

و قانون گویان و مقدمان و رعایا و مزارعان مشار الیہ را نائب فوجداری آنجا مستقل دانستہ از نخبہ حالی و صلاح صوابدید مومی الیہ بیرون نروند و شکر و شکایت را در بارہ خود موثر نپندارند در دست تصدی اجراے امور..... تو ی شناسد تاریخ بست و دوم شہر ربیع الاول سنہ قلمی،

فرمان محمد شاہ بادشاہ غازی بوسیلہ فدوی مسیح خاں	مہر گول سیاہ بڑی تحریر مہر فدوی مسیح خان محمد شاہ بادشاہ غازی الندر سنہ ۱۱۵۳ھ،

چودھریان[۱] وغیرہ پرگنہ انچھا وغیرہ صوبہ بہار بدانستی کہ بموجب پروانہ درگاہی بمہر جملۃ الملک مدار المہام وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر اللہ خان..... بہادر نصرت جنگ تحریر بست و پنجم جمادی الثانی سنہ ۱۷ جلوس مبلغ ہشت لک دام پرگنات مزبور انتقال حمید خاں من ابتداے خریف بارش سنہ ۱۱۴۲ فصلی بجاگیر رفعت و عوالی پناہ شکر اللہ خاں با فرزندان تنخواہ شدہ در عمل غلام حسین خان دیوان سابق برطبق پروانہ درگاہی مطابق حصول نمودہ بسبب شرکت توجہ جاگیر رفعت عوالی پناہ احمد خاں و فضل اللہ خان تفریق دیہات شدہ خود ہا بعمل شامل داشتہ قصبہ داؤد نگر از موضع سلوٹا گھوری دو ہزار بیگہ آراضی از پرگنہ انچھا بموجب فرمان والا شان در وجہ انعام داؤد خاں مرحوم از عہد حضرت مقرر بود در سنہ ۴۹ عہد حضرت بازیافت شدہ یک لک بست و چہار ہزار دام بازیافت از پرگنہ افزودہ بہ تنخواہ درآمدہ من بعد در عہد

(بقیہ حاشیہ فٹ ۳۸) اشارہ ہے کہ فرمان کا تقریباً نصف مضمون حذف کرکے درج کیا گیا ہے، فرمان نہایت طویل ہے ۵ فٹ لمبا ایک فٹ چوڑا، کتابت خط دیوانی، عمال و حکام کی تصدیقیں پشت فرمان پر مندرج ہیں، کاغذ اولی کھردرا سفید۔

[۱] فرمان ہذا مظہر ہے کہ پرگنہ انچھا کی جاگیر حمید خان سے منتقل ہو کر نواب شکر اللہ خان اور ان کے بیٹا احمد خان و فضل اللہ خان کی شرکت میں بہ نجلہ تفریق کی گئی، سرشتہ کی کارروائی پشت فرمان پر خط دیوانی میں ہے کاغذ سفید کھردرا اولی، طول ۳ فٹ عرض ایک فٹ،

حضرت بدستور سابق در وجہ انعام حمید خان و احمد خان نبائر داؤد خان بدستور عہد آنحضرت بحال شدہ دران ہنگام از جمع پرگنہ و تنخواہ جاگیرداران منہا شدہ، دریں ولا وکیل رفعت عوالی پناہا احمد خاں و شکر اللہ خان پروانہ درگاہی مرقوم بودہ بستم جمادی الاول سنہ ۲۴ تاریخ دوازدہم شہر رمضان المبارک سنہ ۲ جلوس،

مندرجۂ بالا شاہی فرامین کے علاوہ اور چند فرمان نواب ممتاز علی خان صاحب کے خریطہ اجواء میں موجود ہیں، جو خط کی شکستگی کے سبب سے پڑھے اور نقل نہیں کئے جاسکے، ان فرامین شاہی سے ظاہر ہے کہ نواب ممدوح کی جان بازی اور کارگذاریوں کے سبب سے مغل بادشاہوں کی نگاہ میں انکی کتنی قدر و منزلت تھی، اور اس عالی مرتبت نواب کی خدمات کے سبب سے نسلاً بعد نسلٍ اونکی اولاد و احفاد کے ساتھ بادشاہوں کی توجہ مبذول رہا کی،

داؤد خاں کی یادگاریں، نواب داؤد خاں مردانہ وحاکمانہ جوہر کے ساتھ تعمیرات سے بھی ذوق رکھتے تھے، جس کے آثار اب تک مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں،

[illegible]ھ میں قلعہ پلاموں کے اندر اور باہر دو مسجدیں تعمیر کیں، اسی ۱۰۷۲ھ میں شہر داؤد نگر[1] کی بنا

[1] بیاض فارسی، داؤد خاں کی پلاموں کی آمد و رفت ساحل سون اور اس نہر کے محاذ پر ہوئی تھی، جو اب سون ایسٹ بنیک (باروں) سے نکل کر دانا پور گئی ہے، اوس مقام پر جہاں اب داؤد نگر کی آبادی ہے، منزل کا موقع ہوگا، اس مقام کی فضا ایسی پسند آئی، کہ یہیں شہر اور قلعہ اور حرم سرا کی بنا ڈالی، مگر خود ممدوح کو قیام کا موقع نہ ملا، اور ان کے اخلاف نے یہاں پر قیام کرکے یادگاریں چھوڑیں، جو اب تک موجود ہیں شہر مذکور کے دو حصے ہیں، ایک پرانی آبادی دوسری نئی، پرانی آبادی داؤد خان اور نئی آبادی احمد خان نبیرۂ داؤد خاں کی تعمیر کردہ ہے، حصار شہر، درے، قلعہ اور حرم سرا کے کھنڈرات اور دوسرے آثار اب تک زبان حال سے شہر کی خوبصورتی کے قصیدہ خواں ہیں، یہ ایک مردم خیز خطہ ہے، سرزمین داؤد نگر سے بڑے بڑے جوہر قابل پیدا ہوئے ہیں، خان بہادر سید اکبر حسین رضوی جج المتخلص اکبر مرحوم کا

ڈالی، اور اس کی آبادی میں وہ تمام باتیں ملحوظ رکھیں، جو ایک خوش قطع و خوشنما شہر میں ہونی چاہئیں، شہر کے اندر قلعہ اور حرم سرائے کی تعمیرات کا کام [illegible]ھ[1] میں شروع کیا، اسی عہد [illegible]ھ[2] میں پٹنہ میں دار العدل قائم کیا، جس کے کتبہ کی لوح آج تھانہ خواجہ کلاں میں لگی ہوئی ہے، اور اس پر یہ شعر کندہ ہے،

بہر عدل و داد مظلوماں ز دست ظالماں ساخت دار العدل جعفر بندۂ داؤد خاں

ان کے علاوہ الہ آباد کی صوبہ داری[3] کے زمانہ میں الہ آباد کو گنگا کے سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک نہایت مضبوط و مستحکم پشتہ تیار کرایا، اور شہر کے باہر ایک بلند سطح پر خلد آباد کے نام سے ایک نئی آبادی بسائی، اور ایک سرائے، مسجد اور کنواں پختہ تعمیر کرایا، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے وطن حصار میں اب تک انکی تعمیرات کے آثار پائے جاتے ہیں، واللہ اعلم،

داؤد خاں کی قابلِ ذکر اولاد و احفاد، داؤد خان کی شہادت کے بعد شاہان ہند نے ان کی اولاد پر بھی توجہ شاہانہ مبذول رکھی، اور وہ مناصب و عہدوں پر ممتاز ہوتے رہے، چنانچہ ان کے خلف[4] اکبر **حمید خان** اورنگزیب عالمگیر کے دامن دولت سے وابستہ رہکر گجرات کی صوبہ داری پر مامور رہے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۲) وطن آبائی اور ایک بیان کے مطابق ان کا جائے پیدائش یہی قصبہ ہے، مگر شہرت عام سرزمین الہ آباد کے قسمت میں تھی، اسلئے وہ الہ آبادی مشہور ہوئے قصبہ داؤد نگر جس پرگنہ میں واقع ہے، وہ اور دوسرے پرگنے مذکور نواب ممدوح کی جاگیر میں تھے، جو فرامین شاہی کے مطابق انکی اولاد و احفاد میں وراثۃً منتقل ہوتے رہے ۱۷۹۳ء کے بندوبست دوامی کے وقت جمع مشخص قبول نہ کرنے کے سبب سے نواب ممدوح کی اولاد و احفاد کے ہاتھ سے نکل کر کچھ عرصہ کے بعد بیشتر حصے جناب منشی امیر علی صاحب مرحوم کٹرا بٹرا کے قبضہ و تصرف میں آگئے، اور اب تک ممدوح مرحوم کے خاندان کے قبضہ میں ہیں، [1] بیاض فارسی [2] از مسودہ تاریخ بہار و پٹنہ مرتبہ مولوی سید فصیح الدین بلخی ریونیو افسر برائے کیلہ اسٹیٹ، [3] بیاض فارسی، [4] داؤد خان مرحوم کے حقیقی اور علاتی کئی بھائی

اور اپنی کارگذاریوں کے صلہ میں خطاب خانی سے سرفراز ہو کر چالیس سال کی عمر میں برہان پور میں ۵ ار
ربیع الآخر ۱۰۹۲؁ھ کو وفات پائی، مقام حمید نگر[۲] جسکی بنیاد حمید خان نے اپنے ہاتھوں ڈالی تھی انکی جانب منسوب ہے

جیون خاں، حمید خاں کی اولاد میں جیون خان نے، بہادر شاہ بادشاہ کے دامن میں تربیت
پائی، اور آدابِ شاہی اور علم مجلس سے آراستہ ہو کر روح اللہ خاں کی جگہ فوجدار حصار مقرر ہوا، اور
جہاندار شاہ کے مقابلہ میں شاہزادہ فرخ سیر کی حمایت کے صلہ میں پنجہزاری[۳] و شش ہزاری منصب او
خطاب خانی و نقارہ سے سرفراز ہو کر کسی جنگ میں شہادت پائی،

احمد خان جیون خان کی اولاد میں احمد خان محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ۱۱۴۴؁ھ میں الہ آباد
کی نیابتِ صوبہ داری کے لئے نامزد ہوا، اس کے بعد عظیم آباد کی صوبہ داری پر مامور ہوا، بنگالہ اور اڑیسہ
کی قابلِ ذکر مہمیں سر کیں،[۴] احمد خاں کے عہد میں[۵] ۱۱۴۵؁ھ میں احمد گنج (داؤد نگر کی نئی آبادی) آباد ہوئی[۶] احمد گنج

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۳) تھے، حقیقی بھائی خان خانان، علاتی صیفی خان، داؤد خان کی ایک اولاد نواب حمید خان
(اول) نواب حمید خان کی تین اولادیں نواب جیون خان، مرتضیٰ خان، الہ داد خان، نواب جیون خان کے دو لڑکے
عنایت اللہ المخاطب بہ نواب حمید خان (ثانی) نواب فقیر اللہ المخاطب بہ نواب احمد خان، نواب حمید ثانی کے ایک لڑکے
نواب محمد شکر اللہ خان، شکر اللہ خان کے چھ لڑکے اسد اللہ خان، اکرام اللہ خان، دولت علی خان، محب علی خان،
روح اللہ خان، رحیم اللہ خاں، نواب احمد خاں کے تین لڑکے غلام غوث خاں، حیدر قلی خان، احسان علی خان
نواب داؤد خان کے حقیقی بھائی نواب خان خاناں کی اولاد، نعمت علی خان، تاتار خاں، احمد خاں، ابراہیم خاں،
المخاطب شمشیر خاں، ابراہیم خاں کے دو لڑکے قاسم علی خاں المخاطب شمشیر خاں ثانی، محمد عاقل خان، تاتار خاں کی اولاد قطب
خان، عبد اللہ خاں، عزیز خاں، انکے علاوہ ان لوگوں کی اور بہت سی اولادیں ہیں، جنکا ذکر طویل ہے، (یہ تفصیل نسب نامہ قریشیان
سے جو بیاض فارسی میں منسلک ہے ماخوذ ہے) [۱] بیاض فارسی، [۲] حمید نگر پرگنہ گوشٹ ویزن اورنگ آباد کا مشہور موضع ہے جو داؤد نگر
کے مشرقی سمت آٹھ نو کوس پر واقع ہے [۳] بیاض فارسی [۴] بیاض فارسی ان مہمات کا ذکر بخوف طوالت قلم انداز کر دیا گیا [۵] بیاض فارسی [۶] احمد گنج

مولا باغ میں اس کا عالیشان مقبرہ اب تک باقی ہے،

ابراہیم خان[۱]، برادر زادہ داؤد خان، نواب داؤد خان کے زیر تربیت ملکی و مالی امور میں کافی
دستگاہ بہم پہونچائی تھی، ابتدا میں وہ داؤد خان کے علاتی بھائی صفی خاں کی رفاقت میں داؤد خان کے
ہراول فوج میں رہا کرتا تھا، اس کے جوہر مردانہ اور کارہائے نمایاں کو دیکھ کر شاہ عالم نے سب سے پہلے
پکھوراوودھ کی فوجداری عطا کی، اسکے بعد گورکھپور اور سرکار شاہ آباد صوبہ بہار کی فوجداری پر مدتوں
سرفراز رہا،[۲] اس عہدہ کے زمانہ میں رحیم خان افغان کی بغاوت کو فرو کیا، اور اسکو قتل کرکے شاہزادہ
عظیم الشان کی خوشنودی حاصل کی، اس کے صلہ میں شاہزادہ والا جاہ کی سفارش سے اضافہ منصب
خطاب شمشیر خانی، خلعت زرین، اور جواہر و شمشیر و فیل و فرمان تحسین و جاگیر عطا ہوئے،[۳] اور فدائی خان ناظم
صوبہ بہار کی نظامت کے زمانہ میں کنور دھیر سنگھ کو جس نے راجہ بھوج پور کو قتل کرکے صوبہ میں ایک فتنہ
برپا کر رکھا تھا، شکست دیکر اور قتل کرکے فتنہ فرو کیا، اس کے صلہ میں فدائی خان کی جگہ نظامت عظیم آباد
سے سرفراز ہوا،[۴] اسکے بعد اودھ کی نظامت پر سرفراز ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیے، شاہ
عالم کے اخیر عہدِ سلطنت میں اردوے معلی میں[۵] شاہزادہ عظیم الشان کی رفاقت میں نظم و انتظام کی خدمت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۴) کی آبادی بڑے اہتمام و نظم سے قائم کی گئی تھی، آبادی کے گرد خندق و خام شہر پناہ ہی، ہر جہار
سمت مختلف ناموں کے سر بفلک پھاٹک ہیں، جن کے آثار اب تک باقی ہیں، یہی آبادی داؤد نگر کی نئی آبادی
کہی جاتی ہے، ان کے علاوہ مضافات داؤد نگر سب ڈویزن اورنگ آباد میں نبائر داؤد خان کی جابجا بیسیوں
یادگاریں ہیں، [۱] ابراہیم خان المخاطب شمشیر خان کی یادگاریں مضافات داؤد نگر میں موجود ہیں موضع شمشیر نگر
اور اس کی عالیشان مسجد و مقبرہ جو حسن و خوبی کا مرقع ہے، یادگار زمانہ ہے، مقام شمشیر نگر پرگنہ انچھا میں داؤد
نگر سے تقریباً تین کوس پر واقع ہے مسجد و مقبرہ محکمۂ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہین، [۲] بیاض فارسی [۳]
[۴] " " [۵] " "

پر مامور رہا، آخر میں عظیم الشان اور جہاندار شاہ کی جنگ میں شاہزادہ کی حمایت میں دادِ شجاعت دیتا ہوا قتل ہوا، خلیفہ گرامی قدر محمد ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ شہادت ارقام فرمائی،

چوں بہادر شہِ عالم زجہاں رخت کشید — خلد منزل گہِ آں شاہ معظم گردید،

پسرانش زپئے جنگ بہ بستند کمر، — آتش توپ و تفنگ از ہمہ سو می بارید

آں یکے گفت بگیر و دگرے گفت کہ دہ — اندراں داد و ستد ...... دلش می لرزید

آں قریشی نسب و حیدر دل رستم دست — خانِ شمشیر کہ نامش بجہاں چوں خورشید

اندراں معرکہ چوں پاے اقامت افشرد — از زبردستی تیغش دلِ دشمن ترسید

سال شہادت ز خرد می جستم

ہاتفے گفت بگو جام شہادت نوشید

ان کے علاوہ نبائر داؤد خاں میں چند ذی اقتدار اور قابلِ ذکر اصحاب اور بھی تھے، مگر بخوف طوالت ان کا ذکر قلم انداز کیا جاتا ہے، آخر میں فاضل دوست مولوی فصیح الدین صاحب بلخی[1] ریونیو آفیسر ہرا کیلہ اسٹیٹ، اور محترم بزرگ نواب ممتاز علی خان صاحب[2] کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ ان دونوں محترمین نے نواب داؤد خاں سے متعلق بعض مواد کی فراہمی میں ہمت افزائی فرمائی جزاھم اللہ خیر الجزاء،

[1] محب موصوف نے جنگ پلاموں کی بعض تفصیلات اور راجہ پلاموں کے حالات پٹنہ و بہار کی تاریخ کے مسودے سے عنایت کئے، [2] محترم بزرگ ممدوح نے بیاض عربی و فارسی سے استفادہ اور فرامین شاہی کے نقل کرنے کی اجازت دی، پبلک لائبریری گیا کے لائبریرین کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے مرقع جنگ کو دکھایا، اور نقل کرنے کی اجازت عنایت کی،

تلخیص و تبصرہ

شمالی نائجیریا میں مسیحی تبلیغ

شمالی نائجیریا میں زیادہ تر اسلامی ریاستیں ہیں لیکن زیر سایہ حکومتِ برطانیہ، اب تک ان ریاستوں میں عیسائی مشنریوں کو تبلیغ کی اجازت نہ تھی، مگر اب کچھ دنوں سے حکومت نے اپنے امتناعی قانون کو ڈھیلا کر دیا ہے اور بعض پابندیوں کیساتھ مسیحی مبلغین کو چند تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، اس مسئلہ کی تاریخ سے متعلق مشنری رسالہ مسلم ورلڈ (اکتوبر ۳۷ء) کے ایک مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

شمالی نائجیریا میں مسیحی تبلیغ کے مواقع پچھلے ڈیڑھ برس میں زیادہ ہوگئے ہیں، کیونکہ اب وہاں کی مسلمان ریاستوں میں بھی تبلیغ کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، حال تک حکومت نائجیریا نے ایک خاص اصول کے ماتحت سوکوتو (Sokoto) کانو (Kano) کٹسینا (Katsina) بورنو اور ان کے علاوہ متعدد دوسری اسلامی ریاستوں میں عیسائی مشنوں کو ممنوع قرار دے رکھا تھا، ایک مشن ریاست زاریہ (Zaria) میں اُسی وقت سے قائم تھا جب سے نائجیریا میں برطانوی حکومت کا تسلط ہوا، ریاست نیوپ میں بھی ایک یا دو مشن کام کر رہے تھے لیکن ان کا کام نیوپ (Nupes) قوم کے لوگوں میں بھی تھا جو مسلمان نہ تھے، شہر کانو سے باہر مشن کی طرف سے کتابوں کی ایک دوکان پندرہ برس سے قائم ہے، نیز چند سال ہوئے کانو میں ایک مشن قائم کرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی، ان مستثنیات کے علاوہ تمام اہم اسلامی ریاستوں میں عیسائیت کی تبلیغ بالکل ممنوع تھی، اور شمالی نائجیریا کی ایک

کرور آبادی میں سے نصف سے زیادہ یورپین مشنریوں کی دسترس سے باہر تھی،

بہر حال گذشتہ اٹھارہ مہینوں میں مشن کی عمارتیں بنانے کے لئے زمینیں دیدی گئی ہیں، البتہ تبلیغ کے طریقوں سے متعلق بعض پابندیاں بھی عائد کردی گئی ہیں، تبلیغی کام کے علاوہ یہ مشن تمام بڑی بڑی اسلامی ریاستوں میں برص وجذام کے مریضوں کے لئے قیام گاہیں قائم کرنے میں حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نائجیریا نے اپنا سابق خیال اب بدل دیا ہے کہ عیسائی مشن سے برطانوی نظم ونسق کو لازمی طور پر نقصان پہونچے گا، آئندہ کسی اسلامی فرقہ میں تبلیغ کی اجازت کا ملنا یا نہ ملنا زیادہ تر مقامی حالات پر منحصر ہوگا،

اسلامی علاقوں میں مسیحی مشنوں کے ممنوع قرار دینے کا اصلی سبب برطانیہ کا وہ طریق حکومت تھا، جسے عام طور پر "بالواسطہ حکومت" (Indirect Rule) کہتے ہیں نظم ونسق میں بالواسطہ حکومت کا طریقہ لارڈ لوگارڈ (Lord Lugard.) نے اختیار کیا تھا جب وہ شمالی نائجیریا کو برطانیہ کے زیر تسلط لائے تھے، اس طریق حکومت کے معنی یہ ہیں کہ نظم ونسق کے طریقے جہاں تک ممکن ہو وہی باقی رکھے جائیں، جو پہلے سے اس ملک میں رائج ہیں، اور حکومت کا انتظام بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے جو قوم کی رائے اور ملک کے رواج کے مطابق حکومت کے خداوند ہوں، یورپین حاکم پیچھے بیٹھا ہوا نگرانی اور ہدایت کرتا رہتا ہے، اور صرف انہی رواجوں کو منسوخ کرنے میں اپنے مخصوص اختیارات استعمال کرتا ہے جنکو وہ ظالمانہ یا رفاہ عام کے لئے مضر خیال کرتا ہے، لارڈ لوگارڈ کے اس طرز حکومت کی کامیابی اس امر سے ظاہر ہے کہ شمالی نائجیریا کا بہت وسیع علاقہ آسانی کیساتھ برطانیہ کے زیر سایہ آگیا، چنانچہ شمالی نائجیریا کے ابتدائی برطانوی حکام نے بھی قوم اور سوسائٹی کے سابق انتظامات کو بدستور قائم رکھا، بالواسطہ حکومت کا تقاضا یہ تھا کہ سابق حکومت کے طریقوں اور ملک کے رواجوں کا تحفظ کیا جائے، یورپین حکام نے اس چیز میں مبالغہ برتا، اور وہاں کے لوگوں

کو تمام بیرونی اثرات سے بچانے کی کوشش کی، اس خوف سے کہ یہ اثرات کہیں ان کے رسم ورواج میں تبدیلی نہ پیدا کریں، لیکن تجارت نہیں روکی جاسکتی تھی، کیونکہ یہ ملک کی دولت کے لئے ضروری تھی، ریل اور موٹر کی سڑکیں بھی ضروری تھیں اور یہ بنائی گئیں، تجارتی کمپنیوں اور حکومت کے محکموں کو مجبوراً جنوبی نائجیریا اور دوسری نوآبادیوں (Protectorates) سے بہتیرے واقف کار اور تعلیم یافتہ افریقیوں کی خدمات حاصل کرنی پڑیں، اور وہ سب کے سب سیاسی تربیت میں شمالی نائجیریا کے لوگوں سے بہت کچھ مختلف تھے، لیکن انکا معاشرتی اثر اسوجہ سے کم پڑا کہ انھیں شہروں سے باہر مخصوص حصّوں میں رکھا گیا، عیسائی مشنوں کا معاملہ دوسرا تھا، ان کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ تجارت کی طرح وہ بھی ملک کی بہبودی کے لئے ایک ضروری چیز ہیں، برعکس اس کے عیسائیت ایک ایسی طاقت تھی جسکے زبردست کلچر کا اثر مقامی کلچر اور رسم ورواج پر پڑسکتا تھا، اسی بناپر عیسائی مشن شمالی نائجیریا کے ایک وسیع علاقہ میں ممنوع قرار دیدیے گئے تھے، جب تک بالواسطہ حکومت کا یہ خیال قائم رہا، مسیحی تبلیغ کو اس علاقہ میں اپنی کامیابی مشکل معلوم ہوتی تھی، اور اسکی امیدوں کا دارومدار اس امر پر تھا کہ خود حکومت کے اس خیال میں تبدیلی پیدا ہوجائے،

مدتوں مشنری سوسائٹیاں کوشش کرتی رہیں، کہ شمالی نائجیریا میں ان کے خلاف جو قانون جاری ہے، وہ کچھ ڈھیلا کردیا جائے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، بالآخر ۱۹۲۰ء میں انٹرنیشنل مشنری کونسل کے سکریٹری نے ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں نائجیریا کے گورنر سر گریم ٹامسن (Sir Graeme Thomson) شمالی نائجیریا کے لفٹنٹ گورنر مسٹر پامر (H. R. Palmer.) اور نائجیریا کے مختلف مشنوں اور کلیساؤں کے نمائندوں کو مدعو کرکے یہ مسئلہ پیش کیا، بحث ومباحثہ کے بعد گورنر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ آئندہ سے گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہوگی، کہ اگر والیان ریاست اپنے علاقوں میں تبلیغ کی اجازت دینا چاہیں تو ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرے، لیکن گورنمنٹ اس معاملہ میں ان پر کوئی دباؤ نہ ڈالیگی،

گورنر نے یہ بھی کہا کہ گورنمنٹ چاہتی ہے، کہ والیان ریاست میں مذہبی رواداری پیدا ہوجائے جو مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے اور وعدہ کیا کہ جب یہ اطمینان ہوجائے گا، کہ تبلیغ کا کام معقولیت اور احتیاط کیساتھ جاری ہوگا، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا، کہ ملکی حکام راضی ہیں تو اسوقت مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کا موقع مشنون کو دیدیا جائے گا،

سر گریم ٹامسن کے بعد سر ڈونلڈ کیمرن (Sir Donald Cameron) نائجیریا کے گورنر ہوکر آئے، یہ پہلے گورنر تھے جنھون نے اُس مبالغہ آمیز طریقہ کی مخالفانہ تنقید کی جو شمالی نائجیریا کے ملکی رسم ورواج کے تحفظ میں برتا جارہا تھا، ۱۹۳۳ء میں جو تقریر انھوں نے نائجیریا کی لیجسلیٹو کونسل میں کی اس میں صاف ظاہر کردیا کہ نائجیریا میں بالواسطہ حکومت جس طریقہ پر جاری ہے، وہ خامیوں سے پاک نہیں مسیحی مشنوں کے بارے مین انھوں نے سر گریم ٹامسن کی پالیسی کو جاری رکھا، اور ان کے آخر دور حکومت میں ایک دو جگہیں مشنون کو اسلامی ریاستوں میں دیجارہی تھیں، ان کے جانشین سر برنرڈ بورڈلین (Sir Bernard Bourdillon) بھی اسی پالیسی پر قائم ہین، کیونکہ متعدد جگہیں مشنروں کو مل گئی ہیں، یا ان کے متعلق بات چیت ہورہی ہے، شمالی نائجیریا کے پولٹیکل افسروں نے بھی ہمدردی ظاہر کی ہے، مبلغین نہایت مسرور ہیں کہ جس چیز کو وہ بالواسطہ حکومت کی ضروریات کی ایک غلط تشریح سمجھ رہے تھے وہ اب اٹھادیگئی، اور آیندہ پورے نائجیریا میں اُن کا مقابلہ کسی اصول حکومت سے نہ ہیگا بلکہ صرف مقامی حالات کی دشواریوں سے ہوگا،

پہلے جن علاقوں میں مسیحی تبلیغ ممنوع تھی، وہان اسوقت تک آٹھ جگہیں تبلیغی مرکز قائم کرنے کیلئے مشن کو دیجاچکی ہیں، انکے علاوہ ہر بڑی اسلامی ریاست میں برص وجذام کے مریضوں کیلئے قیام گاہیں تعمیر کرنے مین بھی حکومت مشن کی مدد کررہی ہے، اور اس قسم کی آٹھ قیامگاہیں فی الحال زیر تعمیر ہیں، اسلامی علاقوں میں تبلیغی مرکز قائم کرنے کیلئے جو اجازت نامہ حکومت کی طرف سے ملتا ہے، اسمیں بعض پابندیاں بھی عائد کردیجاتی ہیں، مثلاً مسجدوں کے قریب اور بازاروں میں تبلیغ نہ کیجائیگی، اور نہ مبلغین ایسے گھروں میں جائیں گے جہان

ان کی تبلیغ پسند نہ کیجاتی ہو، اسی طرح برص وجذام کے مریضوں کے لئے قیام گاہیں تعمیر کرنے کی جو اجازت مشنریوں کو دیگئی ہے، اس میں بھی حکومت نے چند دفعات رکھدی ہین جن کا مقصد یہ ہے کہ ان قیامگاہوں کے مقیم کو اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی آزادی حاصل رہیگی،

زہریلی گیس کے متعلق چند غلط فہمیان

فرانس اپنے باشندون کے ہاتھ پانچ سال کی قسط پر گیس کی نقابیں فروخت کررہا ہے، جرمنی میں ان باشندوں کے لئے جو لڑائی میں شریک نہ ہوسکین گے، ایک نئی قسم کی نقاب زہریلی گیسوں سے بچنے کے لئے خفیہ طور پر لاکھوں کی تعداد میں تیار کیجارہی ہے، انگلستان میں غیر فوجی آبادی کے لئے ایک لاکھ نقابیں ہر روز تیار ہورہی ہیں، تاکہ جزائر برطانیہ کا ہر مرد، عورت، اور بچہ زہریلی گیسوں سے محفوظ رہ سکے،

بہت کم لوگوں کو شبہہ ہے کہ "آیندہ جنگ عمومی" میں زہریلی گیسین کثرت سے استعمال کیجائیں گی، اس وقت کیا ہوگا،؟ کیا شہر کے شہر اور آبادیوں کی آبادیاں ایک لمحہ کے اندر برباد ہوجائیں گی، کیا قومیں ایسی گیسوں کو چھپائے ہوئے ہیں، جن سے اب تک ہم ناواقف ہیں؟ لڑائی چھڑ جانے پر کیا ماہرین سائنس جیسی چاہیں گے نئی نئی خوفناک زہریلی گیسیں تیار کرلیں گے؟ یہ اور اسی قسم کی بہت سی تشویشناک غلط فہمیاں عوام میں پھیلی ہوئی ہیں جنکا ازالہ بڑی حدتک لفٹنٹ کرنل پرنٹس (A. M. Prentiss) نے اپنی جدید مستند تالیف "جنگ میں کیمیائی مواد" (Chemicals in War) میں کردیا ہے، موصوف کا تعلق امریکہ میں کیمیکل وارفیر سروس (Chemical Warfare Service) سے ہے،

وقتاً فوقتاً ہم سنتے ہیں کہ معمولی زہریلی گیسوں سے بڑھکر مہلک ایک "سوپر گیس" (Super gas) ایجاد کی گئی ہے، جسکے چند سو پونڈ اوپر سے اگر نیویارک جیسے شہر کی پوری آبادی کو ہلاک کرسکتے ہین، کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک نے اسے دریافت کرلیا ہے، اور آیندہ جنگ کے لئے اسے چھپائے ہوئے ہے، واقعہ یہ ہے کہ "سنسنی خیز" مصنفوں کے دماغ سے باہر اس گیس کا وجود ہی نہیں ہے، جنگ عظیم کے بعد سے دو تین

نئی گیسیں تیار کی گئی ہیں، لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے ان میں سے کوئی بھی پرانی گیسوں کی نسبت جو اس جنگ میں استعمال کی گئی تھیں، بہت زیادہ خطرناک نہیں ہے اور نہ اس کا امکان ہے کہ کسی قوم نے خفیہ طور پر ایسی گیس دریافت کرلی ہے، یا مستقبل قریب میں دریافت کرے گی، جنگ عظیم کے دوران میں ماہرین کیمیا نے تین ہزار سے زیادہ کیمیاوی مرکبات کا امتحان کیا تھا، لیکن ان میں سے صرف ۳۰ کو اس قابل پایا کہ ان سے جنگ کے لئے گیسیں تیار کرنے کا امکان ہو لیکن جب لڑائی میں انکی جانچ کیگئی تو جنگی ضروریات کے لئے نصف درجن سے زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئیں،

سوپر گیس کے شاذ و نادر ہونے کا سبب آسان ہے، میدان جنگ میں مہلک ثابت ہونے کیلئے کسی گیس کا صرف زہریلی ہونا ہی کافی نہیں، مثلاً جنگ عظیم میں سب سے کم کارآمد جو گیسیں ثابت ہوئیں انہیں ہائڈروسیانک ایسڈ (Hydrocyanic acid) کی گیس بھی تھی، جو ایک نہایت درجہ مہلک زہر ہے، اور اکثر مجرموں کو قتل کی سزا دینے میں استعمال کیا جاتا ہے، اسکی ایک یا دو سانسوں سے موت فوراً واقع ہوجاتی ہے لیکن خوش قسمتی سے بحیثیت گیس کے اس میں یہ نقص ہے کہ ہوا سے زیادہ ہلکی ہونے کی وجہ سے اسکی گیس بجائے زمین کی طرف آنیکے اوپر ہی چلی جاتی ہے،

جنگ میں خطرناک ہونے کے لئے زہریلی گیس کا ہوا سے زیادہ وزنی ہونا ضروری ہے اسکے بنانے کیلئے جن مادون کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ہر وقت آسانی کیساتھ فراہم ہوجائیں، یہ بھی ضروری ہے کہ گیس آسانی کے ساتھ تیار ہوسکے، نیز ذخیرہ میں رہنے سے خراب نہ ہوجائے، اگر یہ صحیح قسم کی گیس ہے، تو اسے معتدل دباؤ سے رقیق بھی ہوجانا چاہئے، تاکہ بموں میں بھری جاسکے، اگر یہ رقیق ہے جیسی کہ بعض لڑائی کی گیسیں ہوتی ہیں تو اسے اسقدر کافی طیران پزیر ہونا چاہئے، کہ معمولی ٹمپریچر پر بھی بخارات کے بادل پیدا کرسکے، ان کے علاوہ کم از کم ایک درجن شرائط اور بھی ہیں، جن کا پورا ہونا ضروری ہے، لہذا ایک ایسی زہریلی گیس کو دریافت کرنا، جو ان تمام خصوصیات کی جامع ہو، تقریباً اتنا

ہی دشوار ہے جتنا ایک ایسے شخص کو ڈھونڈھ نکالنا جو اپنے کام زیادہ تر بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی ہو جسکی آنکھیں نیلی اور ڈاڑھی سرخ ہو جسکا وزن (۱۸۰) اور (۱۸۵) پونڈ کے درمیان ہو، جو سات زبانیں بول سکتا ہو، اور جو بانسری بجاتا ہو،

بہرحال اگر ماہرین کیمیا کوئی غیر معمولی زہریلی گیس کے دریافت کرنے میں ابتک ناکام رہے ہیں، تو جنگی میکانیہ کے ماہروں نے معروف گیسوں کے استعمال کے لئے جدید اور زیادہ ہولناک طریقے معلوم کرلئے ہیں، گیس کی لڑائی میں گیس کے ہوائی حملے ایک نئی چیز ہیں، گذشتہ جنگ عظیم کا کوئی ہوائی جہاز گیس نہیں برساتا تھا، اب زہریلی گیسوں سے بھرے ہوئے بم اوپر سے گرائے جاسکتے ہیں، جو نشانہ پر لگ کر پھٹ جاتے ہیں، رقیق گیسیں بھی اوپر سے چھڑکی جاسکتی ہیں، جو کہرے کی طرح آہستہ آہستہ زمین پر گرتی ہیں، اطالوی ہوا بازوں نے یہ دونوں طریقے ابی سینیا کی جنگ میں آزمائے، اور دونوں ہولناک طور پر کامیاب ثابت ہوئے، ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کی جنگی طاقت کے مقابلہ میں جو گیس کی لڑائی کے مدافعانہ طریقہ سے پوری طرح واقف ہو، یہ طریقے کہانتک کامیاب ثابت ہوتے ہیں، اسوقت تو لوگوں کے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اگر نیویارک یا لندن جیسے بڑے شہروں پر یہ زہریلی گیسیں برسائی گئیں تو پھر کیا ہوگا،؟

لیکن کیا ایسا ہوگا بھی؟ خیال یہ ہے کہ بعض قومیں انتشار اور گھبراہٹ پیدا کرنے کے لئے قصداً اس قسم کا مبالغہ آمیز پروپگنڈا کر رہی ہیں، تاکہ دوسرے ممالک خوفزدہ ہوکر دب جائیں، اور ان ڈرانیوالوں کو بغیر جنگ کئے ہوئے وہ چیزیں مل جائیں جن کے وہ خواہشمند ہیں لیکن اس امر کے قوی جنگی اسباب بھی موجود ہیں کہ بڑے شہروں پر گیس کے ہوائی حملوں کا خطرہ بہت کم ہے،

پہلا سبب تو یہ ہے کہ رقیق گیسوں کو برسانے کے لئے ہوائی جہازوں کو تین سو فٹ کی بلندی تک اترنا پڑیگا، اور یہ چیز بلند عمارتوں کی وجہ سے ان کے لئے خطرہ سے خالی نہ ہوگی، ہوائی جہاز گیس سے بھرے ہوئے بم گرا سکتے ہیں، لیکن بہت سے بم مکانوں کی چھتوں سے ٹکرا کر پھٹ جائیں گے اور نقصان نہ پہنچا سکیں گے

زہریلی گیس کے بم اسوقت تک خطرناک نہیں ہوتے، جب تک سڑک پر گر کر نہ پھٹین، اور اوسطاً دو میں تخمیناً ایک ہی بم سڑک تک پہونچ سکے گا، وجہ یہ ہے کہ زہریلی گیس کے مہلک یا غیر مہلک ہونے کا مدار اسکی مقدار پر ہے جیسے کہ موٹر کے انجن کی گیس اگر بند موٹر خانہ میں خارج کیجائے تو مہلک ثابت ہوتی ہے، اور اگر کھلی ہوئی سڑک پر نکالی جائے تو اس سے کوئی ضرر نہیں پہونچتا، لہذا جب تک ان زہریلی گیسوں کی ایک کثیر مقدار شہر کی سڑکوں میں نہ پھیل جائے ان سے کوئی زیادہ خطرہ نہیں،

جو لوگ لڑائی میں شریک نہ ہوں ان کے دلوں سے گیس کی ہیبت کو دور کرنے کے لئے کافی تیاریان ہو چکی ہین، گیس کے حملہ سے بچنے کے مختلف طریقے لوگوں کو سکھا دیئے گئے ہیں، گیس سے نقلی حملہ کر کے انھیں بتایا جاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے مکانوں کے بعض حصوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، نیز گیس کی نقابوں کا استعمال بھی سکھا دیا گیا ہے، برطانیہ میں گیس اسکول قائم ہو گئے ہیں، جہاں شہر کے باشندوں کو تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ کیونکر اپنے مکان کے ایک کمرہ کو ایسا بنا سکتے ہیں، کہ اسکے اندر گیس داخل ہی نہ ہو سکے، حملہ کے وقت پورا خاندان اس کمرہ میں پہونچ کر گیس کی زد سے محفوظ رہ سکتا ہے لہذا شہر والوں کو بہت زیادہ پریشان ہونیکی ضرورت نہیں، البتہ میدان جنگ کے سپاہیوں کا معاملہ دوسرا ہے،

ایک عام خیال یہ ہے کہ جو لوگ زہریلی گیس کی زد میں آجاتے ہین، وہ اگر ہلاک نہیں بھی ہوتے، تو دق کا شکار ضرور ہو جاتے ہیں، لیکن ایک ڈاکٹر نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ گیس زدہ سپاہیوں میں دق کے مریضوں کا جو تناسب تھا، اس کا نصف ان سپاہیوں میں بھی تھا، جو گیس کی زد سے محفوظ تھے، جہاں تک گیس سے ہلاکت واقع ہونے کا تعلق ہے، جنگ عظیم کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر گیس کا اثر ہوا، ان میں سے صرف دو فی صدی ہلاک ہوئے، حالانکہ دوسرے مجروحین میں سے پچیس فی صدی سے زیادہ مر گئے،

"ع ز"

(پ س)

اخبار علمیہ

آفتاب کے داغ

اندنون آفتاب کے داغ جتنے بڑے بڑے نظر آرہے ہیں، اس سے پہلے غالباً کبھی نہیں دکھائی دیئے، جنکو ہم آفتاب کے داغ کہتے ہیں، وہ دراصل بڑی بڑی آندھیاں ہوتی ہیں، جو آفتاب کے گرد تیزی کے ساتھ چلتی رہتی ہیں، ان داغوں کا ایک مجموعہ جس کا مجموعی رقبہ تقریباً چار ارب مربع میل ہے، ابھی حال میں دیکھا گیا ہے، یہ اتنا بڑا ہے، کہ کسی دوربین کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے، البتہ چکاچوند سے بچنے کیلئے ایک رنگین چشمہ لگانے کی ضرورت ہوگی، ان میں سے دو داغ بہت زیادہ بڑے ہیں، یعنی ہر ایک کا قطر ایک لاکھ بیس ہزار میل ہے، اس سے قبل آفتاب کے داغوں کے دو اس سے بھی بڑے مجموعے نظر آچکے ہیں، ایک فروری سنہ ۱۹۱۷ء میں، اور دوسرا جنوری سنہ ۱۹۲۶ء میں جو اسوقت تک سب سے بڑا تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جو داغ آجکل نمایاں ہیں، وہ ابھی بڑھ رہے ہیں، اور پیشین گوئی کی جاتی ہے، کہ وہ پھیلاؤ میں ابھی اور بڑھیں گے،

ان داغوں کے پیدا ہونے کا سبب معلوم نہیں، ہر داغ ایک بگولہ ہوتا ہے، جس کے اندر سے گرم بخارات تیزی کے ساتھ اٹھکر اوپر کی طرف آفتاب کی سطح پر آتے ہیں، آفتاب کی سطح پر ہوا کا دباؤ نسبتہً کم ہوتا ہے، اسوجہ سے یہ بخارات پھیلتے ہیں، اور پھیلنے کی وجہ سے وہ کسی قدر ٹھنڈے بھی ہو جاتے ہیں، اور ان کی چمک بھی کم ہو جاتی ہے، پھر بھی وہ پورے چاند سے ہزاروں گنا زیادہ روشن ہوتے ہین اور ان کی حرارت کا درجہ (ٹمپریچر) سات ہزار ڈگری (Fahrenheit فارنہیٹ) ہوتا ہے، تاہم یہ طوفانی

داغ اپنے زیادہ گرم اور زیادہ روشن پس منظر کے مقابلہ میں سیاہ معلوم ہوتے ہیں،

ان داغوں کی شکلیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں لیکن گولائی کسی نہ کسی حد تک سب میں پائی جاتی ہے قد میں بھی بہت فرق ہوتا ہے، اب تک سب سے چھوٹا داغ جو دیکھا گیا ہے، اس کا قطر صرف تین سو میل کا ہے، اور سب سے بڑے داغ کا قطر ساٹھ ہزار میل کا ہو سکتا ہے، عموماً ذیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتے، ایک یا دو ہفتہ میں غائب ہو جاتے ہیں لیکن ۱۸۴۰ء-۴۱ء میں ایک داغ اٹھارہ مہینوں تک قائم رہا، اور یہ ان کے قیام کی سب سے بڑی مدت ہے، جو اب تک معلوم ہو سکی ہے،

ایک سال کے اندر ایک ہزار سے زیادہ داغ دکھائی دے سکتے ہیں ۱۸۹۳ء میں (۱۴۶۴) داغ نظر آئے تھے، جو اسوقت تک ایک سال کی سب سے بڑی تعداد ثابت ہوئی ہے، ابتک سب سے کم تعداد ۱۹۰۱ء کی ہوئی، یعنی صرف (۲۹) یہ آندھیاں کئی کئی ایک ساتھ جلوس کی شکل میں چلتی ہیں، اور آفتاب کے ساتھ گردش کرتی ہیں، اگر ان کا جلوس دو ہفتہ سے زیادہ قائم رہ جاتا ہے، تو وہ مغربی کنارے سے نظروں سے غائب ہو کر پھر ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ آفتاب کیساتھ نصف کرہ کی گردش دو ہفتہ میں پوری ہوتی ہے،

"ع ز"

لنڈبرگ اور ڈاکٹر کیرل کی طبی تحقیقات

مشہور ہواباز لنڈبرگ آج کل ڈاکٹر الیکسس کیساتھ اسکے یوروپین تجربہ خانہ میں کام کر رہا ہے، یہ ڈاکٹر الیکسس وہی ہے جس نے طبی تجربہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ اعضا جسم سے باہر نکال کر کے بھی زندہ رکھے جا سکتے ہیں، اور ایک جسم کا عضو دوسرے میں پیوند کیا جا سکتا ہے، اس تجربہ پر اسکو اب سے پچیس برس قبل نوبل پرائز بھی مل چکا ہے، اسکے اس تجربہ میں چوزوں کے دل کو غیر فانی زندگی حاصل ہو گئی ہے، اب یہ خلیات ایک تہائی صدی تک قائم رہ سکتے ہیں، اور ان کی زندگی میں کسی قسم کی کمی نہ ہو گی چنانچہ ایک دولتمند آدمی چاہے تو اپنے تمام اعضاء کو مرنے کے بعد بھی بالکل زندہ رکھ سکتا ہے،

۱۹۳۵ء تک بہت سی رکاوٹیں بیچ میں ایسی تھیں جن سے ہر عضو پر تجربہ نہیں کیا جا سکتا تھا، مثلاً جسم سے علیحدہ کئے ہوئے گردے کے [illegible] کو زندہ رہنے کے لئے خون کا سیلان ضروری ہے، اس کے لئے یہ کوشش کی گئی کہ ایک پمپ یا مصنوعی دل کے ذریعہ سے اس عضو کے Blood-vessel میں سیلان کو جاری کیا جائے، مگر پمپ سے Blood-vessel پھول کر پھٹ جاتا، اور پھر سیلان مناسب طور پر جاری نہیں ہوتا، ایسی صورت میں عضو کی زندگی مشکل تھی،

اسی اثنا میں لنڈبرگ ڈاکٹر کیرل کی نگرانی میں کام کر رہا تھا، اور یکایک ۱۹۳۵ء کے جون میں راک فیلر انسٹی ٹیوٹ کے طبی رسالہ سے ایک نئے پمپ کی دریافت کی خبر ملی جس کا نام "لنڈبرگ دل" تھا، اس سے اگلی مشکل بالکل دور ہو گئی، اب اس مصنوعی دل کے ذریعہ سے Blood-vessel تک ایک تیز دھار جاتی ہے یہی نہیں بلکہ شریان کے اندرونی پردہ کے پاس ایک ہلکی سی موج بھی اٹھتی ہے جس سے اسکو غذا پہونچتی رہتی ہے، اس طرح یہ سیلان کی تیز رفتار سے محفوظ رہتا ہے، کیرل کے تجربہ کا مقصد انسان کی زندگی کو بڑھانا ہے، اس تجربہ کے لئے اس نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی ہے، لنڈبرگ سے اسکو اپنی تحقیقات میں پوری مدد ملی ہے، کیا عجب کہ وہ اس کے بعد موت کی روک تھام کی بھی کوئی تحقیق پیش کریں (بشرطیکہ اس سے پہلے خود ان کی موت کا دن نہ آجائے)

دنیا کے نامعلوم حصے

ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ دنیا کے تمام حصے معلوم کئے جا چکے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے، لنڈبرگ نے جنوبی امریکہ میں ایک بہت ہی طویل اور خطرناک ہوائی سفر کیا، اور اس نے ایسے گم شدہ شہروں کی تصویریں لی ہیں، جن کا پتہ آثار قدیمہ کے ماہروں کو ذرا نہ تھا، بعض فرانسیسی ہوابازوں نے صحرائے اعظم کے ایسے مقامات کی سیر کی، جہاں کثرت سے انسانی آبادی تھی، لیکن اب تک کوئی سیاح وہاں نہیں پہونچ سکا ہے، بازو

کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ بحر منطقہ بارد جنوبی کا خطہ ٹونٹہ کی کانوں سے بھرا ہے، روسیوں نے قطب شمالی کی برفستانی چٹان پر ایک سال زندگی بسر کی، امیزن کے جنگلات میں کیڑوں کی اتنی کثرت ہو کہ وہ ایک وقت میں ہزاروں انسانوں کو کھا جا سکتے ہیں، یہیں ۱۹۲۵ء میں فاوسٹ گم ہوا تھا اور اب تک لاپتہ ہے کبھی کبھی اسکے زندہ ہونے کی افواہیں سننے میں آجاتی ہیں، کانٹا، کانگو کا وہ عظیم الشان مرطوب حصہ جہاں نیند کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے، جنوبی اسٹریلیا کی پرتی زمین، منگولیا کا اندرونی ویرانہ گرین لینڈ اور بفینلینڈ وغیرہ وغیرہ اب تک انسانی قدموں سے محفوظ ہیں،

یہ تو زمین کی بالائی سطح کے خطوں کا حال ہے، کانوں میں اب تک پونے دو میل اور تیل کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ دو میل کی گہرائی میں جا سکے ہیں، حالانکہ زمین آٹھ ہزار میل گہری ہے، سمندر کی سطح کے نیچے ببب صرف نصف میل تک جا سکا ہے، اگرچہ سمندر کی گہرائی سات میل اور اس سے بھی زیادہ ہے، اور اگر خیالی براعظم اطلانتس کو حقیقی مان لیا جائے، تو پھر وہاں کی گہرائی چھتیس ہزار فیٹ قرار پاتی ہے، ہوا باز ہوائی طیاروں میں زیادہ سے زیادہ بارہ میل اوپر جا سکے ہیں، حالانکہ فضا کی اونچائی ۵۰ میل بلکہ ۲۰۰ میل تک ہے،

"ص ع"

نفسیاتِ ترغیب

کسی انسان کو کسی کام، یا چیز یا تحریک کے لئے ہم کیونکر آمادہ کر سکتے ہیں، اور اسکو ترغیب اور شوق دلا سکتے ہیں، اس کے نفسیاتی اصول کیا ہیں، اس کتاب میں انہی اصول کی تشریح ہے، تجارت، اشتہارات اور تقریر و وعظ میں ہر جگہ ان اصول کی رعایت کی ضرورت ہے، اسلئے تجارت کے مشتہرین، واعظین، مدرسین اور وکلا، سب کو اس کتاب کی ضرورت ہے، ضخامت ۲۱۱ صفحے، قیمت عہ/ ؛

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

تنقید قاموس المشاہیر از جناب سید احمد اللہ صاحب قادری تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد دیدہ زیب قیمت سے/ پتہ سید احمد اللہ صاحب اڈیٹر تاریخ عثمان شاہی حیدرآباد دکن،

آٹھ دس سال ہوئے مولوی نظام الدین حسین صاحب بدایونی نے قاموس المشاہیر کے نام سے دو جلدوں میں مسلمان مشاہیر کے حالات لکھے تھے، آج سے تین چار سال قبل مولوی احمد اللہ صاحب قادری نے بعض رسائل میں اسکی پہلی جلد پر تنقید کر کے کتاب مذکور کی غلطیاں دکھائی تھیں، یہ غلطیاں زیادہ تر اسمائے اعلام اور سنین کی ہیں، بعض واقعات کی بھی ہیں، اب انھوں نے اس تنقید کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، ہم نے حوالوں سے تو اسکی مطابقت نہیں کی، لیکن اکثر غلطیاں صحیح معلوم ہوتی ہیں، بعض بعض کتابت و طباعت کی غلطیاں ہیں، جو نظر انداز کرنے کے لائق تھیں، اس حیثیت سے یہ تنقید لائق ستائش ہے کہ محض غلطیاں دکھا دی گئی ہیں، اور کوئی دلآزار طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، امید ہے کہ اس سے قاموس المشاہیر کی طبع ثانی کے وقت اغلاط کی تصحیح ہو جائے گی،

خطبۂ صدارت نواب سر محمد اکبر خان چیف آف ہوتی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نہایت معمولی، قیمت ۱عہ/

ہندوستان کے مسلمان امراء میں نواب سر محمد اکبر خاں بالقابہ چیف آف ہوتی، اس حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں کہ آپ کو دولت دنیا کے ساتھ دولت علم سے بھی وافر حصہ ملا ہے، موصوف نے

انجمن حمایت اسلام کے ۳۴ئہ کے اجلاس میں یہ خطبۂ صدارت پڑھا تھا، آپکے ذوق کی مناسبت سے اس خطبہ کی حیثیت ایک مفید علمی مقالہ کی ہوگئی ہے جس میں مسلمانوں کے علمی خدمات اور تمدنی ترقیوں اور اس سے یورپ کے استفادہ پر نہایت مفید اور پر از معلومات تبصرہ ہے، علمی خدمات و کمالات خصوصیت کیساتھ زیادہ تفصیل سے دکھائے گئے ہیں، لیکن کتابت و طباعت کی بکثرت غلطیوں کی وجہ سے اسکی ظاہری شکل مسخ ہوگئی ہے نفس واقعات میں بھی بعض فرو گذاشتیں ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ خطبۂ صدارت نہایت مفید اور پر از معلومات ہے۔

نذر عقیدت مرتبہ جناب سید ابو الفضل محمود صاحب بی اے ایل ایل بی عثمانیہ تقطیع بڑی، ضخامت ۲۳۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ ابو الفضل سید محمود صاحب ڈیوڑھی سید محمود صاحب مرحوم اندرون فتح دروازہ و مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ و عبد القادر صاحب تاجر کتب چار مینار حیدر آباد دکن،

عربی فارسی اور اردو کے بہت سے شعراء نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں اپنی عقیدت کے نذرانے پیش کئے ہیں، جناب ابو الفضل سید محمود صاحب نے ان عقیدت ناموں کو جمع کرکے یہ گلدستہ تیار کر دیا ہے، حضرت شیخ سے عام عقیدت رکھنے والوں کے لئے عموماً اور وابستگان سلسلۂ قادریہ کیلئے خصوصاً یہ نذر عقیدت ایک قیمتی تحفہ ہے،

جدید دستور کا خاکہ از شفیق الرحمن صاحب قدوائی تقطیع بڑی ضخامت ۲۱ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۲ر، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے "جدید دستور کا خاکہ" کے نام سے انگریزی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر تبصرہ لکھا تھا جس میں اس کا ضروری خلاصہ بھی آگیا تھا، جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی نے انگریزی سے ناواقف لوگوں کی آسانی کے لئے ہندوستانی میں اسکا ترجمہ کر دیا ہے، ترجمہ سلیس ہے، اسکے دیکھنے سے جدید دستور کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

"م"